ہجومِ آئینہ

(شاعری)

ڈاکٹر فرید پربتی

ہجومِ آئینہ

(شاعری)

ڈاکٹر فرید پربتیؔ

ہجومِ آئینہ

(شاعری)



ڈاکٹر فرید پربتی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

منظر نامہ



HAJOOM-E-AIENA

(Poetry)

by

Dr. Farid Parbati

Year of Ist Edition 2010
ISBN: 978-81-8223-621-9
Price Rs. 500/-

نام کتاب	:	ہجومِ آئینہ (شاعری)
مصنف	:	ڈاکٹر فرید پربتی
پتہ	:	ہل ویو کالونی، وانہ بل، راولپورہ، سرینگر-۱۹۰۰۰۵ (Mob: 09419402078)
کمپوزنگ	:	نسیم اختر
سن اشاعت	:	۲۰۱۰ء
قیمت	:	۵۰۰ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی-٦

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com



● - ہمارا عصر خبر، حقائق اور معلومات کے فنی نظام کے ہاتھوں میں ایک تابع مہمل کا رول نبھارہا ہے۔ ایک تخلیق کار ہمیشہ سنگ بستہ حقائق سے متصادم ہونے کے بجائے بیچ کا راستہ نکالنے کی تلاش میں رہتا ہے۔ میری شاعری اسی بیچ کا راستہ نکالنے والے کی ''کتھا'' ہے۔

آج تک میرے بارے میں جتنا کچھ لکھا گیا ہے اس کو میں نے کبھی اپنے احتساب کا آئینہ نہیں بنایا کیونکہ میں اپنے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ میں اپنی خوبیوں اور خامیوں سے کماحقہٗ واقفیت رکھتا ہوں اور باخبرانہ زندگی گزارتا ہوں۔ میں بنئے کی طرح کبھی اپنا گڑ چھپا کر نہیں کھاتا ہوں۔ میں اپنے تخلیقی تجربے سے، اپنے حالات سے، اپنے مقسوم سے اکیلے ہی سامنا کرتا ہوں اور ایک دن اپنی موت سے بھی اکیلے ہی سامنا کروں گا۔ اسی وجہ سے میری ہر کاوش انفرادیت کا ہار سنگار پہن کر منصۂ شہود پر آتی ہے۔ میں اپنے عصر کی اتھل پتھل سے واقف ہوں اور اس اُتھل پتھل کے تقاضوں سے بھی میں ہمیشہ قدم قدم پر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں اور یہ میری انفرادی عادت بن گئی ہے۔ اگرچہ میں نے بچپن میں اماں سے سن رکھا تھا کہ طلسمات میں پیچھے مڑ کر دیکھا نہیں جاتا اور اس عمل کو دہرانے والے پتھر میں ڈھل جاتے ہیں۔

شاعری کا منظر نامہ دلکش بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ اُفق شعر پر متعدد رنگ ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزرتے ہیں اور ہر رنگ کو اصرار ہے کہ وہی سب سے زیادہ سچا اور موزون رنگ ہے۔ میرے نزدیک شاعری اظہارِ ذات کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ یہ اپنے اصل مفہوم کے لحاظ سے زمان ومکان کی حدود وقیود سے یکسر بالاتر ہوتی ہے۔ شاعری جدید ہے نہ قدیم بلکہ صرف شاعری، متنوع اظہار کے سانچوں کے باوجود یہ اپنی اصلیت کی دفع کرتی ہے۔ نغمہ خواں کبھی اِکتارے اور کبھی سنطور کا سہارا لے کر اپنے سننے والوں کو متوجہ کرتا ہے اور مسرت اور بصیرت کی وادیوں کی سیر کرواتا ہے۔

کوک کروں تو جگ ہنسے اور چپکے لاگے گھاؤ
ایسی کٹھن سنیہہ کا بدھ کروں اُپاؤ

کبیر جی

سخنے از حرم ذات کنم یا نہ کنم
دھر از محرمِ آیات کنم یا نہ کنم

حکایات چنیں برمی آید کہ ایں وزن اختراع شدہ بلکہ از تودۂ مردم
فارسی زبان اقتباس کردیدہ"

رباعی دراصل شخصی ایجاد نہیں بلکہ یہ لوک گیت کی نہایت ہی قدیم صنف ہے جو ترقی کرکے اعلیٰ شاعری کی صنف بن گئی ہے۔ اصل میں قدیم ایران میں "ترانہ" ایک صنف کی حیثیت سے رائج تھی۔ اس کا وجود ایرانی شاعری میں نورِ اسلام سے قبل بھی ملتا ہے۔ اس سے اس کے شخصی ایجاد کا قصہ بالکل فرضی معلوم ہوتا ہے۔

رباعی جس طرح ایرانی الاصل ہے اسی طرح اس کے اوزان بھی ایرانی زا ہیں اور اہل فن نے بحر ہزج (مفاعیلن۔ چار بار) سے اختراع کئے ہیں۔ رباعی "سنطور" پر گائی جانے والی صنف ہے۔ سنطور ثقیل آوازوں کا متحمل نہیں ہوسکتا...... رباعی کے اوزان میں جو لحنیں پیدا ہوتی ہیں موسیقی کی اصطلاح میں ان کو "ترانہ" کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس وزن سے پیدا ہونے والی لحنیں فنِ موسیقی میں بڑی پسندیدہ اور ایرانی موسیقی کے مذاق کے عین مطابق تھیں اس لئے ان اوزان کا نام ہی ترانہ رکھ دیا گیا۔ المعجم فی معائر اشعار العجم کے مؤلف محمد بن قیس رازیؔ کی رائے بھی یہی ہے۔

"اہل دانش ملحونات ایں وزن را ترانہ کردند"

وزنِ رباعی کے استخراج کے سلسلے میں جو بنیادی اصول مدنظر رکھا جاتا ہے وہ سبب پئے سبب وتد پئے وتد ہے، یعنی رکن اوّل اگر سبب پر ختم ہوجاتا ہے تو اگلا رکن بھی سبب ہی سے شروع کیا جائے گا۔ اسی طرح وتد پر ختم ہونے والے رکن کے بعد والا رکن وَتد ہی سے شروع ہوگا۔ مثلاً

ا۔ مفعول	مفاعلن	مفاعیلن	فَع
سبب وتد (مفروق)	وتد وتد	وتد+سبب+سبب	سبب
۲۔ مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فَع
سبب سبب سبب	سبب+وتد	وتد+سبب+سبب	سبب

پہلا رکن وَتد پر ختم ہوا اسی لئے دوسرا رکن وتد ہی سے شروع ہوجاتا ہے۔ اوزانِ رُباعی کے سلسلے میں کل نو زحاف مختص کئے گئے ہیں۔

● ۔اس میں دو رائے نہیں کہ غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف سخن ہے اور رباعی کو ہمیشہ طفیلی صنف سخن کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں پہلا سبب یہ ہے کہ فن رباعی کی تفہیم آج تک کسی ثقہ صاحبِ فن کے ہاتھوں سے نہیں ہوئی ہے باوجودیکہ رُباعی کے آثار ہمارے ادب میں ابتداء ہی سے پائے جاتے ہیں۔ دوئم رباعی کا فن کافی ریاض طلب فن ہے اور ہمارے تخلیق کار دقتوں کا سامنا کرنے سے ہمیشہ جی چراتے رہے ہیں۔ سوئم غزل کا جادو اس طرح سروں پر چڑھ کر بول رہا ہے کہ باقی اصناف پر پسماندگی کی گرد چڑھ گئی ہے۔

رباعی ایرانی الاصل (عجمی) صنف سخن ہے۔ اس کی ایجاد کا سہرا ایرانی شعراء کے سر جاتا ہے۔ فٹز جیرالڈ "EDWARD FITZ GERALD" کے عمر خیام کی رباعیوں کے ترجمے سے رباعی کا لفظ دنیا کی ہر زبان میں پہنچ گیا۔ اردو ادب میں رباعی نے اپنا چراغ فارسی رباعی کے چراغ سے روشن کیا ہے۔

رباعی صنفِ نظم میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس صنف میں اختصار کے ساتھ جامعیت کی جو صفت نظر آتی ہے وہ دیگر اصناف میں مفقود ہے۔ رباعی مختصر صنفِ سخن ہے جس میں مقررہ اوازن، وحدتِ فکر اور تسلسلِ بیان کی پابندی از حد ضروری ہے۔ یہ صنفِ سخن دیر تک متنازعہ فیہ رہی ہے۔ اکثر تذکروں میں یہ بات دہرائی جاتی ہے کہ ''یعقوب صفّار کا ایک کمسن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا۔ ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڈھے میں جا گرا۔ بچے کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرعہ نکلا ع

غلطاں غلطاں ہمی رود تا لبِ گو

یعقوب بھی موجود تھا۔ اُسے بچے کی زبان سے یہ موزوں کلام بہت پسند آیا۔ چونکہ اُس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے۔ شعراء کو بلا کر کہا کہ یہ کیا بحر ہے؟ انہوں نے کہا ہزج ہے۔ پھر تین مصرعے اور لگا کر رباعی کر دیا اور دوبیتی نام رکھا۔ مدت تک یہی نام رہا۔ پھر دوبیتی کے بجائے رباعی کہنے لگے۔ موجودہ تحقیق کی روشنی میں رباعی کے شخصی ایجاد ہونے کی تردید کی جاتی ہے۔ محققین کی فہرست میں پروفیسر پرویز ناتل خانلری کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ڈاکٹر خانلری کی رائے ہے:

این نوع شعر از مدت ہا قبل در ایران شائع و رائج بود۔ واز ہمیں

میں لایا گیا......اس طرح کا سلوک رباعی کے ساتھ روا نہیں رکھا گیا ہے۔ اس وجہ سے رباعی پسماندگی کا شکار ہو چکی ہے۔

داستانِ عہد گل را از نظیریؔ بشنوید
عندلیب آشفتہ ترمیگویدایں افسانہ را

● - میری تربیت صوفیانہ ماحول میں ہوئی جس شخص نے میرے کان میں اذان دی وہ صوفی تھا۔ میرے منہ میں پہلا چمچہ ڈالنے والا بھی صوفی تھا۔ میرے والد صوفیت کے زبردست دلدادہ تھے مگر میں نے اپنے اوپر صوفیت کو حاوی ہونے نہیں دیا، تصوف کے سات دروازے ہیں، میں چھ سے گذر چکا ہوں۔ اگر ساتواں عبور کیا ہوتا تو میں اپنے مریدوں کے درمیان ہوتا یا کسی گوشۂ عزلت میں۔

میں ہمیشہ شاعری میں جدید وقدیم کے امتزاج کا قائل رہا ہوں۔ میں نے شاعری کے اُس دبستان کے زیر اثر اپنی شاعری کی ابتداء کی جس کو شاعری کا کلاسیکی دبستان کہا جاتا ہے۔ اگر چہ میں زبان اور عروض کے بنیادی نکات سے حتی الوسع واقفیت رکھتا ہوں مگر میں نے اپنی عروض دانی کو اپنی شاعری پر حاوی ہونے نہیں دیا بلکہ بسا اوقات کسی سقم سے واقفیت رکھنے کے باوجود اس کو ویسے ہی رہنے دیا کیونکہ میرے نزدیک شعریت ہی شاعری کی اصل روح ہے اور لفظی وفنی دروبست ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دکاں سب سے الگ

سرینگر فرید پربتی



خرب۔کف۔قبض۔جب۔ہتم۔تخنیق۔حرم۔شتر۔بتر۔

کئی عروضیوں نے اپنی تحقیق کے ذریعے رباعی میں نئے اوزان شامل کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان کی حیثیت ایجاد بندہ سے زیادہ کچھ نہیں۔کیونکہ اُن حضرات نے نہ ہی سنطور دیکھا ہے نہ اس کی لحنوں سے حظ اُٹھانے کا موقعہ ملا ہے۔اسی لئے ان کا اجتہاد ان ہی تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہمارے یہاں رُباعی کے آثار ابتدأ باضابطہ طور دکنی شعراء کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ ہر زمانے میں شعراء نے رباعی پر طبع آزمائی کی۔جن شعراء کی شہرت میں رباعی نے اضافہ کیا......ان میں مومن،انیس،دبیر،مرزا یگانہ چنگیزی،جوش ملیح آبادی،رواں اُناوی،امجد حیدرآبادی،آسی غازی پوری،فراق گورکھپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔امجد نے اپنی رباعیوں میں رباعی کے اصل مزاج کو برقرار رکھا ہے اور صوفیانہ مضامین تک ہی محدود کر دیا ہے......اس کے باوجود ان کی رباعیوں میں سرشاری اور سرمستی کے ساتھ ساتھ بے ساختگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے جو اُن کے کیف واثر میں زبردست اضافہ کر دیتی ہے چونکہ وہ عملی صوفی تھے اسی وجہ سے تصوف اُن کے یہاں وارداتِ قلبی کا درجہ رکھتا ہے۔

رباعیاتِ یگانہ،یگانہ آرٹ کا ستون اوّل ہے۔ان کے یہاں داخلیت کے ساتھ ساتھ بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ان کی رباعیوں کے مصرعے اتنے ہموار ہیں کہ احساس ہوتا ہے کہ ایک شفاف ندی بہہ رہی ہے اور رباعی کا مشکل فن اُن کے اظہار میں کہیں بھی مانع نہیں آتا......لکھنؤ کے مخصوص محاورے جس سلیقے سے ان کی رباعیوں میں قید ہو چکے ہیں اُس سے اُن کی رباعیوں میں مزید لطف پیدا ہو چکا ہے۔یگانہ اردو میں پہلا خود پسند اور خود پرست شاعر تھا۔رباعی کا فن ان ہی چیزوں کا متقاضی ہے۔ان کی رباعیاں پڑھ کر ڈاکٹر جانسن کا یہ قول یاد آتا ہے۔

"HIS ART HAS THE HIGH EST TOUCH OF FINISH SIGNIFICANT AND CONDENSED TO THE ALMOST".

اُردو ادب میں رباعی کا وافر سرمایہ موجود ہے مگر جس طرح وقتاً فوقتاً غزل کا انتخاب عمل

ہزار امکاں



شاعر کوئی بھی ہو۔اس کے شناختی انفرادو امتیاز کا تعین ایک دشوار گزار عمل ہے لیکن معاملہ یہ ہے کہ اس پل صراطِ معنی سے گذرے بغیر یہ اندازہ لگایا بھی نہیں جاسکتا کہ کس دور میں کن شاعروں نے عصری تقاضوں کے مطابق فنی و جمالیاتی ،لسانی ومعنیاتی اعتبار سے اردو شاعری کی شعری جمالیات کی تشکیل وتوسیع جدید میں کون سا کردار ادا کیا ہے۔ہاں مگر شرط یہ ہے کہ شاعر کی شاعری میں کوئی ایسی شان، حکمت یا جادو ضرور ہو جو صاحبانِ نظر کو شعر کی گہرائیوں میں اُترنے پر مجبور کردے۔

اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو فرید پربتی کی شاعری اپنے مطالعہ و محاسبہ کا جواز بہر حال رکھتی ہے۔نئی نسل میں شعر کہنے والے تو ہیں لیکن ایسے جو واقعی عمدہ اور امکانات سے پر شاعری کررہے ہیں ان میں فرید پربتی اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔اس منفرد شناخت کے کئی اسباب ہیں اوّل یہ کہ فرید پربتی شعر کے منصب سے واقف ہیں۔مختلف ومتضاد روایات وتجربات اور تحریکات ورجحانات کو برتتے ہوئے اُردو شاعری آج جس مقام تک پہنچی ہے فرید پربتی اس مقام اور اس کے تمام جہات وامتیازات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔اس لئے فرید پربتی کی شاعری میں لسانی وشعری تہہ داری اور فکری و جمالیاتی پہلوداری کے ایسے اور کتنے نمونے ملتے ہیں جو اُن کے کم ہی ہم عصروں کے یہاں نظر آتے ہیں۔

فرید پربتی کم وبیش بیس برسوں سے مشقِ سخن کررہے ہیں۔اس عرصہ میں انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار اُردو شاعری کی تقریباً تمام اصناف اور ہیئتوں میں کیا ہے لیکن بغور دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ بنیادی طور پر ان کے شاعرانہ جوہر اُن کی غزلوں اور رباعیوں میں کھلتے نظر آتے ہیں۔

اَبرِ تر (1987ء)، آبِ نسیاں (1992ء)، اثبات (1995ء)، فرید نامہ (2003ء) اور گفتگو چاند سے (2005ء) کے بعد ”ہزار امکاں“ فرید پربتی کے آسمان شعر کا

میں نے فرید کے بارے میں پہلے بھی لکھا ہے کہ فرید پربتی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل وہ صنف ہے جس میں عصری تہذیبی اور معاشرتی روایات اور تقاضوں کا اظہار جمالیاتی زبان میں ہوتا ہے۔ لہٰذا روایات اور اجتہادات کے مختلف ومتضاد مرحلوں سے گذر کر آج کی غزل بھی معاشرتی اور ثقافتی مدوجزر کی مختلف النوع لہروں اور دائروں کو اپنے اندر سمیٹتی ہوئی اردو شاعری کے لسانی، معنیاتی اور جمالیاتی امکانات کو زیادہ سے زیادہ روشن اور وسیع کر رہی ہے۔ چنانچہ فرید پربتی کے مجموعے ''ہزار امکاں'' کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ فرید پربتی کی غزلیہ شاعری (بلکہ نظمیہ شاعری بھی) اُردو غزل (شاعری) کی مضبوط و مستحکم روایت پر اپنی اساس رکھتی ہے لیکن اپنے انداز میں اپنی تخلیقی شرطوں کے ساتھ۔ ورنہ فرید پربتی کے اکثر و بیشتر ہم عصر شاعروں کے یہاں روایت کا احترام تو ملتا ہے لیکن عام طور پر سینئر شعراء کے مضامین اور طرزِ بیان کی نقل و تکرار کی صورت میں۔ یہی خاص بات فرید پربتی کی قوت اور ان کے ہم عصر شاعروں کی کمزوری ہے۔ دراصل فرید پربتی کی شاعری میں یہ امتیاز، اساتذہ کے غیر معمولی لسانی شعور اور اظہار و بیان کے مثالی نمونوں (Patterns) کی گہرائی واقفیت کا نتیجہ تو ہے لیکن اس ضمن میں فرید پربتی کے یہاں عام طور پر Conventional اور Referential معانی سے الگ الفاظ کا جو تازہ کار اور تہہ دار لسانی برتاؤ ملتا ہے اس کی وجہ سے فرید پربتی کی غزل کلاسیکی غزل کے لسانی اور اظہاری رویوں سے رشتہ قائم رکھتی ہے لیکن دوسری جانب عصری زندگی اور ثقافت کے حوالے سے سوچ اور فکر کو تخلیقی تجربہ کے بطور شعر میں پیش کرنے کی ہنرمندی کے سبب جدید ترین لسانی، فنی اور جمالیاتی شعور کا جواز بھی پیش کرتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا ہے ''یہ بالکل ممکن ہے کہ غزل جدید بھی ہو اور کلاسیکی اصولوں کی پابندی بھی کرے''، فرید پربتی کی غزل اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس کا اندازہ ''ہزار امکاں'' میں شامل اس طرح کے اشعار سے لگایا جاسکتا ہے ۔

جب حدِ ادراک پھاند بے کراں کہنا مجھے
خالی از اندیشۂ سود و زیاں کہنا مجھے

''چھتناور'' ہے جہاں فرید پربتی کی تازہ ترین غزلوں، نظموں اور متفرق اشعار کا وافر ذخیرہ نظر آتا ہے اس چھتے در کے اندر داخل ہو کر اگر موضوعاتی، ہیتی، لسانی اور جمالیاتی محاسن کے حوالے سے فرید پربتی کے شاعرانہ انفراد و امتیاز کا تجزیہ کریں تو صاف معلوم ہوگا کہ فرید پربتی اپنی شاعری کے اس مقام پر کھڑے ہو کر واقعتاً اُردو شاعری کا ساتواں در کھول رہے ہیں۔

فرید پربتی نے اپنے اس تازہ ترین شعری مجموعہ کا آغاز حمدیہ اور نعتیہ اشعار سے کیا ہے۔ یوں حمد و نعت روایتی اصناف ہیں پھر بھی چونکہ خدا اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم، ہر مقام، معاشرہ، عصر اور ثقافت کے لئے ابدی اور اصلی حقیقتیں ہیں اس لئے ہر زباں، زمانہ اور تہذیب کے اندر فطری تغیرات کے باوجود حمدیہ اور نعتیہ اشعار کا ظہور ہوتا ہی رہا ہے۔ خصوصاً مشرق کی اسلامی ثقافت سے رشتہ رکھنے والی زبانوں کے حوالے سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ فرید پربتی نے اپنے سبھی شعری مجموعوں میں حمدیہ اور نعتیہ اشعار اہتمام کے ساتھ شامل کئے ہیں اور اس سے فرید پربتی کی ثقافتی بنیادوں کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ فرید پربتی نے حمدیہ اور نعتیہ افکار و خیالات کا اظہار دل کی گہرائی سے جدید ترین لسانی و تخلیقی شعور کے ساتھ کیا ہے۔ ان کا انداز درج ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے :

حمدیہ اشعار:

سمیع کہنا ، بصیر کہنا ، علیم کہنا ،حکیم کہنا
وہ اپنی عظمت سے خود ہے واقف اُسے تو ربِ عظیم کہنا
نوازشیں کیا، عنایتیں کیا، ہے باغ و بن کی روش روش پر
گلوں کو نکہتِ کلی کو رنگ، عطا ہے کس کی نسیم کہنا

نعتیہ اشعار:

جب سخن آپؐ بہ شریں رطبی کرتے تھے
خوش نوایانِ چمن اپنی نفی کرتے تھے
کوئی پتھر بھی اگر مارے دعائیں دینا
یہ وہی کام ہے جو پیارے نبی کرتے تھے

پیدا ہوگئی ہے اور غزل کی شان میں بھی اضافہ ہوا ہے ۔

بیتاب ، بے قرار ، مزاجاً کرخت تھا
شاید مرا رفیق بھی ایک تیرہ بخت تھا

کئی دنوں سے محبتوں کی فضاء ہے ناخوشگوار جاناں
نظر نظر میں ہوس ہے قائم نہ دل کا نکلا غبار جاناں

قلب ونظر کا مسئلہ یوں حل بھی ہے
اے دل تری تباہی، کچھ اپنا سبب بھی ہے

تاریک مناظر کو بدلتا ہوں اکیلا
مرقد کا دِیا بن کے میں جلتا ہوں اکیلا

اُردو غزل میں عاشق اور معشوق ، زاہد اور شیخ ، ناصح اور رقیب زندگی اور زمانہ کے حوالے سے راست اور واضح کردار سازی کی روایت ہے۔ یہ کردار عام طور پر شاعر کے تخیل وتصور کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ترقی پسند غزل سے قطع نظر کلاسیکی غزل سے لے کر جدید غزل تک ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں ان کرداروں کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ غزل میں انسان اور انسانیت مخالف فضاء پیدا ہوئی اور کردار قاری کے اندر یاسیت ، بے یقینی حتیٰ کہ خودکشی تک کے رجحانات پیدا کرنے کا سبب بنتے رہتے ہیں ۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھ مر چلے

درد

شکستہ پیکروں میں رنگ بھرنا آگیا ہوگا
ہوا کے ایک جھونکے سے بکھرنا آگیا ہوگا

خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے ایک اِک دکان پر

فرصت جو ملے خود سے ملاقات بھی ہوگی
دیوار کے سائے سے نئی بات بھی ہوگی

دوران گفتگو نیا پہلو نکل پڑے
میں آپ کہنا چاہوں مگر تو نکل پڑے

نیندوں کا قحط خوابوں کی ارزانی بڑھ گئی
تجھ سے بچھڑ کے اور پریشانی بڑھ گئی

قربت کے سنہرے باب سے ڈر
جل جائیں گے آنکھیں خواب سے ڈر

غزل میں نادرونایاب مشکل اور غیر روایتی ردیف وقوافی کا استعمال اب عام سی بات ہوگئی ہے لیکن نئے معتبر شاعروں میں عرفان صدیقی، اسعد بدایونی، عبدالاحد ساز اور عالم خورشید کے ساتھ ساتھ فرید پربتیؔ بھی ایسے شاعر ہیں جس نے اس بات میں محض جدت پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے بلکہ تازہ مضامین اس طرح باندھے ہیں کہ شعر میں معنوی پہلوداری بھی



سمیع کہنا ، بصیر کہنا ، علیم کہنا ،حکیم کہنا
وہ اپنی عظمت سے خود ہے واقف اُسے تو ربِ عظیم کہنا

نوازشیں کیا ، عنایتیں کیا ، ہے باغ و بن کی روش روش پر
گلوں کو نکہتِ کلی کو رنگ، عطا ہے کس کی نسیم کہنا

دلوں کے سب بھید جانتا ہے صدا صدا ہے اُسی پہ روشن
رحیم و رحمٰن صفت ہے اس کی اُسے تو ربِ کریم کہنا



اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ذوقؔ

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا میں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

آتشؔ

آکے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اُس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے

شکیب جلالی

لیکن آج عبدالاحد ساز، عالم خورشید، راشد انور راشدؔ وغیرہ کے ساتھ ساتھ فرید پربتیؔ کے یہاں جو کردار سامنے آرہے ہیں وہ محض تخیل وتصور کی پیداوار نہیں بلکہ نئے معاشرہ کے مختلف ومتضاد حالات وحقائق، سوچ وفکر اور اعمال اور روّیوں کے زائدہ حقیقی کردار ہیں جو قاری کے اندر عصری زندگی اور زمانہ کے حوالے سے جینے کا نیا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔

تاریک مناظر کو بدلتا ہوں اکیلا
مرقد کا دیا بن کے میں چلتا ہوں اکیلا
مانا کہ میرے پاؤں لہو رنگ ہوئے ہیں
حالات کے کانٹوں کو مسلتا ہوں اکیلا

اس طرح موجودہ منظر نامے پر اُردو شاعری کے معیار کا مستحکم جواز پیش کرنے والے شعراء میں فرید پربتیؔ ایک اہم نام ہے اور ''ہزار امکاں'' اُن کی شاعرانہ ہنرمندی کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے کافی ہے۔

سرینگر

پروفیسر قدوس جاوید





ہوتی ہے جب فضا کبھی مسموم بے طرح
کٹتا ہے پھر حسینؑ کا حلقوم بے طرح

جب دیکھتا ہوں پھول سے بچے کو گود میں
آتا ہے یاد اصغرؑ معصوم بے طرح

کٹنا تھا کیوں پسند نہ جھکنا تھا کیوں پسند
کھلتا ہے ہر جری پہ یہ مفہوم بے طرح

دنیا ہے وہ فرات جہاں کل حسینؑ کو
رکھا گیا تھا پانی سے محروم بے طرح

یہ عصر کربلا سے نہیں کم کسی طرح
ہر حق پرست ہے یہاں مظلوم بے طرح

اپنی شکست ہی کو سمجھتے ہیں فتح لوگ
کس بات پہ مچاتے ہیں یہ دھوم بے طرح

دل میں بسا ہے عشقِ حسینؑ و حسنؑ فریدؔ
اس وجہ سے چمکتا ہے مقسوم کی بے طرح





جب سخن آپؐ بہ شریں رطبی کرتے تھے
خوش نوایانِ چمن اپنی نفی کرتے تھے

کوئی پتھر بھی اگر مارے دعائیں دینا
یہ وہی کام ہے جو پیارے نبیؐ کرتے تھے

رو برو اُنؐ کے نہ تھی نام ونسب کی قیمت
آپؐ سکھلا کے عمل سب کو غنی کرتے تھے

پھینک دی ریت تو دھنسنے لگے اُس میں کفّار
دستِ اللہ سے وہ جیسے رمی کرتے تھے

جنگ ہو صلح ہو رہتے تھے حدوں میں ہر وقت
تھا جو فرمانِ خدا آپؐ وہی کرتے تھے

واقعہ یاد دلاتا ہوں سراقہؓ کا تمہیں
دیکھو محبوبِ خداؐ کیسے دھنی کرتے تھے

چلتے پھرتے تھے حقیقت میں وہ قرآن فریدؔ
اس لئے خلق کی چھاؤں کو گھنی کرتے تھے



مجھے گرانے کی دُھن اُس پہ ہے سوار بہت
مرا سلوک اُسے دوستانہ رہتا ہے

ملن ہی جس کا ہے مضمون نہ درد فرقت کا
مری زباں پہ اک ایسا فسانہ رہتا ہے

کبھی میں رہتا نہیں دشمنوں سے ہوں خائف
انہیں سے زیست کا مجھ کو بہانہ رہتا ہے

برستا ہے تو برستا ہے بانجھ پر
یہ ابر میری طرح بے ٹھکانہ رہتا ہے

فریدؔ لگتا نہ شاعر ہے اپنے نکھ سکھ سے
مزاج اس کا فقط شاعرانہ رہتا ہے





ہَوا مزاج ہے اور عاجلانہ رہتا ہے
مجھے تو اُنس اُسے والہانہ رہتا ہے

بنایا اُس نے جہاں کو بہت ہی عجلت میں
توازن اِس لئے یاں جا بہ جانہ رہتا ہے

یہاں پہ خوف زدہ جس ہَوا سے ہے ایک ایک
اُسی کی زد پہ میرا آشیانہ رہتا ہے

زمیں کے رنگ کا اُس نے بچھا دیا ہے دام
اُسی کے نیچے یہ آب و دانہ رہتا ہے

بچا کے رکھ لئے جو خواب اپنی خاطر ہیں
اُنہیں کی تاک میں سارا زمانہ رہتا ہے



گماں کی سرحدوں سے پار نکلا
ہَوا رفتار میرا یار نکلا
جسے پرپیچ سمجھا تھا میں اب تک
وہ رستہ آخرش ہموار نکلا
وہ برفیلی فضا میں پلنے والا
مرے جیسا ہی آتش خوار نکلا
تجھی سے تجھ کو دیکھو مانگتا ہے
ترا طالب بھی دنیا دار نکلا
میں خواہاں خود سے ملنے کا بہت ہوں
مگر یہ مرحلہ دشوار نکلا
تمنا، خواب، یادیں ، کچھ نہ چھوڑا
وہ سُونا کرکے سب بازار نکلا
نگل ڈالے ہیں تارے ظلمتوں نے
تجسّس میرا شب بیکار نکلا
بھلکّڑ ہم فریدؔ اس کو تھے سمجھے !
وہ یادوں کا امانتدار نکلا





کوئی طلب نہ کوئی آرزو ہے میرے پاس
گذشتہ عیش کی اک گفتگو ہے میرے پاس

غنی کرے گا مجھے تیرا بس مرا ہونا
نہیں ہے کچھ بھی ضرورت جوتُو ہے میرے پاس

چلا رہا ہے ہَوا میں ہی تیر جو اکثر
عجیب طور کا وہ جنگجو ہے میرے پاس

یہ جانتے ہوئے شورہ زمیں کا مالک ہوں
اُسے یقین ہے طرزِ نمو ہے میرے پاس

ہدف بنانے لگا میری کن کلاہی کو
وہی جسے ہے پتہ آبرو ہے میرے پاس

تصنّعات کا قائل نہیں ذرا بھی میں
اگرچہ کثرتِ ہر رنگ و بو ہے میرے پاس

تلاش فوج جسے خندقوں میں کرتی ہے
چھپا ہوا وہی میرا عدو ہے میرے پاس

میں آزمانے لگا ہوں خموشیاں اپنی
اگرچہ مملکتِ ہاؤ ہو ہے میرے پاس

تمام جسم کو ڈسوا رہا تھا سانپوں سے
عجیب شخص وہی جس کی خو ہے میرے پاس

کبھی کروں گا فرید اس زمین کو سیراب
رگوں میں دوڑتا تازہ لہو ہے میرے پاس



وقت بے وقت یونہی کرتا ہے ناشاد مجھے
عیش کے دن وہ دلاتا ہے بہت یاد مجھے

ہے مرا پختہ یقیں سنگ میں ڈھلنے سے قبل
اس طلسمات سے کردے گا وہ آزاد مجھے

چیختا ہوں تو بہت اس کو مزا آتا ہے
اس لئے کرتا ہے وہ مائل فریاد مجھے

غیر نے جس کو اُٹھایا بڑی ترتیب کے ساتھ
وہ سمجھنے لگا اُس فتنے کی بنیاد مجھے

بے طرح کھلنے لگی سب کو مری بے سمتی
کس جگہ لے کے چلا ہے مرا ہمزاد مجھے

جامہ زیبی سے تری مجھ کو نہیں کچھ اِنکار
پر لبھاتا ہے بہت حسن خداداد مجھے

جانتا ہوں کہ مقابل میرا روئیں تن ہے
اس لئے کرنا پڑا خود کو بھی فولاد مجھے

میرا ہر دُکھ وہ سمجھتا ہے فریدؔ اپنا دُکھ
یہی اِک زعم نہ کردے کہیں برباد مجھے





سخن گواہ ہے جو میری نیک نامی پر
نثار کرتا ہوں وہ تیری خوش کلامی پر

سفید فاموں نے دنیا پہ وہ ستم ڈھائے
کہ شرم آتی ہے اپنی سفید نامی پر

سگِ زمانہ بھی جس کو سمجھ رہا ہے عار
کیا ہے وقف میں نے خود کو اُس غلامی پر

جو دائروں میں ہمیشہ ہی چلتے رہتے ہیں
وہ حرف رکھتے ہیں تیری صباخرامی پر

وہ دوسرے کے کبھی عیب گن نہیں سکتا
نگاہ جس کو ہمیشہ ہو اپنی خامی پر

جو معترف ہیں اُنہیں پر نہیں کرم ان کا
عتاب کرتے ہیں وہ اپنے ہر سلامی پر

جو مارنا تھا مخالف پہ اب کے مجھ کو فریدؔ
وہ تیر میں نے چلایا ہے اپنے حامی پر





اِک معمے کی ہوئی نشو ونما پانی پر
کر گیا ہوں میں رقم حرفِ وفا پانی پر

میری تو پیاس بجھے گی ترا کیا جائے گا
والیٔ آب نہ یوں دل کو دکھا پانی پر

بارہا آگ پلائی گئی پھولوں کو یہاں
بارہا کاٹے گئے دستِ صبا پانی پر

یاد کے گہرے سمندر میں نہ ڈالو پتھر
دائرے کھینچتی ہے موجِ ہوا پانی پر

تیرنے والے کہاں دیکھتے ہیں موجوں کو
فیصلہ چھوڑتے ہیں اچھا برا پانی پر

کاغذی ناوَ یہ کیا پار اُتارے گی فریدؔ
خود کو نادان تماشا نہ بنا پانی پر





مدّت سے مجھے اُن کے خیالاں نہیں آتے
بھولوں میں اُنہیں ایسے کمالاں نہیں آتے

تیار ہے دینے کو جواب اُن کا زمانہ
کیوں یاد مجھے اپنے سوالاں نہیں آتے

نافہ بھی میسر نہیں یادوں کا ہے دل کو
اب دشت میں رم خوردہ غزالاں نہیں آتے

پھیکا ہے پڑا تب سے ہر انداز سخن کا
جب سے یہاں شرین مقالاں نہیں آتے

سورج ہے کہ ٹوٹا ہوا بچے کا کھلونا
یکمشت کئی دن سے اُجالا نہیں آتے

بے جڑ کے درختوں پہ ثمر لگتے نہ دیکھا
دیکھو ہمیں بھی ایسے کمالاں نہیں آتے

ٹھنڈا پڑا ہر جذبہ مرا جن سے بچھڑ کر
اِس سمت وہ آسودہ جمالاں نہیں آتے





ہم فکر دل وجاں میں فغاں کرنہیں پاتے
وہ اب کے گزرتی ہے بیاں کرنہیں پاتے

اس درجہ بڑھے نقل مکانی کے یہاں شغل
تعمیر کہیں پر بھی مکاں کر نہیں پاتے

اک موسمِ سفاک کی زد پر ہیں ہمیں کیوں؟
کیا اس لئے کہ مشتقِ سناں کرنہیں پاتے

یہ کیا کہ شب و روز فقط اُن کی تمنّا
یہ کیا کہ محبّت کو عیاں کرنہیں پاتے

شاخوں سے لپٹتی ہے ابھی صرصرِ موہوم
بے برگ و نوا عزمِ جواں کرنہیں پاتے

اے خواہشِ دل نقش نہ کر آبِ رواں پر
نظّارۂ اندوہ نشاں کر نہیں پاتے





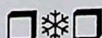
ایک احساسِ ضرر مجھ کو دیا
خود سے لڑنے کا ہنر مجھ کو دیا

پھول ، سبزہ ، شاخ سب اُس نے لئے
اک نہالِ بے ثمر مجھ کو دیا

باغ کی رونق ہوئی جس سے ہَوا
وہ فسادِ خشک و تر مجھ کو دیا

پشت ہمت، بے بصر اور سُست گام
دیکھ کیسا راہبر مجھ کو دیا

ماحصل سے بے یقیں کر کے فریدؔ
مرحلوں کا دردِ سر مجھ کو دیا





رہ شکستہ ، فاصلے ، دشت وسراب
سلسلے ہیں ، زیست کے ، دشت وسراب

کچھ نہیں میرے لئے جُز تشنگی!
میری قسمت میں لکھے ، دشت وسراب

اُس جگہ مجھ کو اڑا لائی ہوا !
ہیں جہاں کے آسرے دشت وسراب

کیوں نہ قیمت خودشناسی کی بڑے
آئینے بننے لگے دشت و سراب

جانے کس کے گھر مجھے لے جائیں اب
بے نوائی ، رت جگے دشت وسراب





کارِ دنیا میں نہ کھو جائیں یہ سب ڈر نکلے
ہم تری یاد کو سینے سے لگا کر نکلے

اب اُسی شہر میں کرتا ہوں طلب جائے اماں
لوگ جس شہر سے جان اپنی بچا کر نکلے

میرے ہر خواب کی تعبیر سے گھبراتے ہیں
ہاں مرے بھائی بھی یوسفؑ کے برادر نکلے

کل تلک تول رہے تھے یہی پھولوں میں مجھے
آج کیا بات ہے آمادۂ خنجر نکلے

وقت کے ایسے تصوّر سے لرز اٹھتا ہوں
جب ہوا کاٹ کے ہر شاخِ ثمرور نکلے

ماں کے قدموں میں ہے جنت کہیں محروم نہ ہوں
یہ سبب ہے نہ کبھی چھوڑ کے ہم گھر نکلے

شوخ جھونکا تھا صبا کا کہ تھی چلتی مقراض
جتنے طائر تھے چمن میں سبھی بے پر نکلے

حال میں آپ تھے اپنے ہی گرفتار فریدؔ
پھر بھی آشوبِ زمانہ میں اُبھر کر نکلے





رَگ و پے میں سرایت کرگیا وہ
مجھی کو مجھ سے رخصت کرگیا وہ
نہ ٹھہرا کوئی موسم وصلِ جاں کا
متعین راہ فرقت کر گیا وہ
من و تو کی گری دیوار سر پر
بیاں کیسی حقیقت کر گیا وہ
درونِ خانہ سے غافل ہے لیکن
برونِ خانہ زینت کر گیا وہ
سر شب ہی میں اکثر جل بجھا ہوں
ہر اک خواہش کو لت پت کر گیا وہ
حوادث کا وہ تند و شوخ جھونکا
ثمر دل کے اکارت کر گیا وہ
متاعِ غم چھپا کر کیوں نہ رکھوں
حوالے یہ امانت کر گیا وہ
تمہیں بھی بھولنے کی کوششیں کی
کہ خود پر بھی قیامت کر گیا وہ
سکوں آمیز لمحوں میں فریدؔ اب
فروغِ رنج و محنت کر گیا وہ





عہدِ وفا، قول وقسم، اللہ بس، باقی ہوس
تیرے ستم ، تیرے کرم ، اللہ بس باقی ہوس
بادِ صبا ، تتلی کلی ،غنچہ سمن، رنگِ چمن
ایک ایک کرجائیں گے رم، اللہ بس باقی ہوس
تاروں کے جھرمٹ میں لگی لوچاندنی پھر جھومنے
سونا بکھرتی دم بدم، اللہ بس ،باقی ہوس
پیاسی زمیں،پیاسے مکیں،ترسیں گے کب تک بے یقیں
چھم چھم برس ابرِ کرم، اللہ بس ،باقی ہوس
سب منزلیں ، سب کارواں، اوّل فنا آخر فنا
گردِ سفر، نقشِ قدم ، اللہ بس باقی ہوس
کوفہ ورے یہ جام وقتے من جملہ حاصل بس یہ ہے
جمشید ہو یا جامِ جم، اللہ بس، باقی ہوس
کرتے ہیں بس اہلِ ہوس دین ودھرم کی باتیاں
یہ فتنۂ دیر و حرم ، اللہ بس باقی ہوس
تو نے فریدؔ اب کے کہیں کیسی یہ مستانی غزل
جذبات کا یہ زیر وبم، اللہ بس باقی ہوس



ہوا مزاج ہیں ہم لوگ جانتے ہی نہیں
کہاں قیام ہے کرنا کہاں ٹھہر جانا





بھول جائے گا بھلا کیسے یہ منظر کوئی
پھنکتا آس کے شیشے پہ ہے پتھر کوئی

ڈال دے خاک نہ اب اُس کی طلب پر کوئی
پھر سے نکلا ہے تجھے ڈھونڈنے گھر گھر کوئی

وہ سمجھ بیٹھے تھے اُس کو بھی شناور کوئی
لے کے ڈوبا ہے اسے تیز سمندر کوئی

اب غمِ زیست نے ہر سمت سے آ گھیر لیا
مجھ کو کر دیتا غمِ عشق میسّر کوئی

بھول بیٹھا ہوں یہ کوتاہ قدوں میں یارو
آ ہی جائے گا مرے قد کے برابر کوئی

پا بہ جولاں کہیں کر دے نہ مجھے روک یہ ٹوک
رستہ روک رہا ہے مرا اکثر کوئی

میری ہر جیت نے رُخ بدلا اِسی منطق پر
کہ حمایت کے لئے آئے گا لشکر کوئی

دل تو بھولا تھا اُسے وقت کے دھارے پہ مگر
یاد آتا ہے مجھے پہلے سے بڑھ کر کوئی

میں انہیں بھولا ہوں اس میں ہے صداقت اتنی
بھیج دیتا ہے یہ اکثر انہیں لکھ کر کوئی

کیا زوالِ من و تو قرب میں پرکھو گے فریدؔ
فاصلہ اور بڑھا دیتا ہے مل کر کوئی





خلوص و مہر کی طرزِ ادا نہ راس آئی
تمہارے شہر کی آب و ہوا نہ راس آئی

میں جانتا ہوں کہ ماتم کا ماحصل کیا ہے
اسی لئے مجھے آہ و بکا نہ راس آئی

بچی کھچی ہوئی سانسوں کا دے رہا ہوں حساب
سلگتی ریت کو رم جھم ذرا نہ راس آئی

دیا جو تو نے وہ لوٹا دیا سبھی میں نے
مجھے یہ دوستی گندم نما نہ راس آئی

بجھا ہے دل کو کنول عرصۂ بہار میں ہی
شگفتہ پھول کو بادِ صبا نہ راس آئی

اُداس شام کے سائے یہ پوچھتے ہیں فریدؔ
محبتوں کی تجھے کیوں ضیا نہ راس آئی





قربت کے سنہرے باب سے ڈر
جل جائیں گی آنکھیں خواب سے ڈر
یہ وصل کی فصل بھی بیتے گی
فرقت کے روزِ حساب سے ڈر
دلگیر کرے گا وہ چہرہ
رنگوں کی ایسی کتاب سے ڈر
جل تھل ہے غموں کی ہر کھیتی
ہرجائی بادو سحاب سے ڈر
خوشبو کے تعاقب میں چل کر
صد برگ اور گلاب سے ڈر
اظہار کی سولی پر چڑھ کر
انکار کے آب و تاب سے ڈر
سبزے کی طرح روندے گا تجھے
اخلاص کے پائے رکاب سے ڈر
کوشش نہ بھلانے کی اُسے کر
یادوں کے سخت عذاب سے ڈر
بے ڈھب ہیں ترے جذبات فریدؔ
مضراب سے ڈر نہ رباب سے ڈر





اُمیدوں کا سجا ہوا محمل ہے زیرِ آب
مدت کی دوڑ دھوپ کا حاصل ہے زیرِ آب

اے چشمِ گریہ ناک یہ منظر بھی دیکھنا
کشتی ہے سطحِ آب پہ ساحل ہے زیرِ آب

پانی تمہاری یاد کا سر سے گزر گیا
اب تم کو بھی پکارنا مشکل ہے زیرِ آب

مچلی ہے موج موجِ تمنّا جو دید کی
شاید اسی سبب سے مرا دل ہے زیرِ آب

ٹھہروں اگر تو وسوسہ طغیانیوں کا ہے
اور لوٹنا بھی چاہوں تو منزل ہے زیرِ آب





سر پہ رنج و تعصب نہیں آتے
سوچتا ہوں میں کب نہیں آتے

مدتوں جی لیے مگر اب تک
زندہ رہنے کے ڈھب نہیں آتے

ٹھن گئی جنگ کے حریفوں میں
امن کے روز وشب نہیں آتے

جن کو کہنا تھا روبرو اُن کے
وہ سخن تا بہ لب نہیں آتے

توڑنے دامنِ تہی کا بھرم
تیری محفل میں سب نہیں آتے

بات کوئی ضرور ہوگی فریدؔ
یاد وہ بے سبب نہیں آتے





رہِ تمنّا قدم قدم رہ گزارِ بے سنگ میل نکلا
قلیل سمجھا میں جس سفر کو وہی بالآخر طویل نکلا

غبارِ وحشت اسی ڈگر پر جنوں کو بے دست و پا نہ کردے
غمِ جہاں سے غمِ وفا تک جہاں پہ ہر پل عجیل نکلا

وہ اک سخن اعتبارِ صبر و شکیب جس کو کہا گیا تھا
وہ اک سخن ہی دُکھا کے دل کو فروغِ متنِ دلیل نکلا

عتاب نمرود بے ثمر ہے یہ معجزہ کم نہیں یارو
میں عصرِ حاضر کے سنگ و آہن سے بچ کے مثلِ خلیلؑ نکلا

حصول مرہم میں حد سے گزرا مآل دیکھا یہ عجلتوں کا
نمک سے بھرنے تمام زخم کو پھر سے دستِ جمیل نکلا

وہ ایک لمحہ جو اہلِ دل کو سکھا گیا بے کرانیاں ہے
وہ ایک لمحہ ہی شہرِ جاناں سے کر کے آخر ذلیل نکلا

مآل وحشت اگر یہی ہے تو پھر یہ کیا ہے فریدؔ صاحب
ہر ایک رشتہ رہِ تمنا میں خونِ دل کا کفیل نکلا

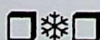


کتابِ صبر میں لکھا ہوا حرفِ اعادہ ہوں
جہاں پر تم نے چھوڑا تھا وہیں پر ایستادہ ہوں





ہوگئی ہے زندگی بے رنگ و آب
آخرش اُس نے دیا سیدھا جواب
راستوں کے پیچ وخم بتلا گئے
ایک دن ہونا ہے مجھ کو کامیاب
خواب کی کھڑکی کھلا رکھ کر نہ سو!
آگیا ہے شہر میں پھر انقلاب
میں اُسے اس سے لگا ہوں مانگنے
دیکھ نادانی مری! میرے جناب
میرے آنگن کو ضرورت ہے بہت
بھیج دے اس میں کوئی تازہ گلاب
میں نہیں بادِ صبا کا معترف
بے وطن ہوں پر نہیں خانہ خراب
کہہ رہی ہے کب سے میری بے حسی
ہوش مندی کا کریں گے احتساب





چور ساغر عیش کا ساغر شکن نے کردیا
کام اچھا یہ نہیں اُس پرفتن نے کردیا
مرگئے بے تیشہ اکثر چاہنے والے یہاں
کیا کوئی کارِ نمایاں کوہکن نے کردیا
ہر خس وخاشاک کی محضر پہ مہریں لگ گئیں
مجھ کو رخصت اس طرح اہلِ چمن نے کردیا
اک ذرا بھاتا نہیں ہنگامۂ عیش ونشاط
دل بہت بیزار کیفِ انجمن نے کردیا
اب میں اپنے آپ سے لڑتا ہوں اکثر بے سبب
کس قدر خودسر مجھے شوریدہ پن نے کردیا
اب صبا کی آمد وشد لطف کا مظہر نہیں
معترف صرصر کا اُس کے بانکپن نے کردیا
کررہا ہوں اب حذر پرپیچ رستوں سے فریدؔ
مجھ کو آسودہ خیالِ راہ زن نے کردیا



ابتری پھیل گئی بزم جہاں میں اتنی
کہ کھلا رکھ کے درِ خواب کو سونا مشکل





نفع و ضرر سے واسطہ مبہم نہیں ہوا
شیرازہ اپنی ذات کا برہم نہیں ہوا

میں حاشیہ نشیں ہوں کسی ذوالجلال کا
اب تک خمارِ گندم و جو کم نہیں ہوا

آنکھوں کی پتلیوں میں مقیّد ہے کائنات
لیکن فشار ذات سے محرم نہیں ہوا

اپنی طلب کا جس کو میں حاصل بتا سکوں
اب تک عطا مجھے وہی عالم نہیں ہوا

گردن کشی پہ تُل گیا وہ خنجر پُرآب
سارا لہو جو چھاٹ کے بیدم نہیں ہوا

محفوظ میرے ذہن میں دھندلے نقوش ہیں
میں رفتگاں کی یاد میں محکم نہیں ہوا

کیسے بھلا سکے گا تری صحبتیں فریدؔ
اے ہاشمی[1] خلوص میرا کم نہیں ہوا

---

[1] ......پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

قطعہ

دھوپ کی حدّت سے وہ کملا گئے
جو نگاہوں میں بچا رکھے تھے خواب
انکشافِ ذات کا ہے مرحلہ
لکھ رہا ہوں پھر سے اک تازہ کتاب
کون سمجھے گا دنوں کی اُلجھنیں
کون جانے گا شبوں کا اضطراب
گن رہا ہوں کب سے میں سانس یہاں
کر رہا ہوں دھڑکنوں کا پھر حساب
یہ ملنگوں کو نہیں دیتا ہے زیب
کیوں کریں گے ہم بھی فکرِ نان وآب
جب لگا آسان کرنے زندگی
بن گئی تب اور بھی یہ اک عذاب
ہوگئیں راہیں میری تاریک تر
روشنی کا منتظر ہوں آفتاب
سب اثاثہ لٹ چکا جب اے فرید
اُس کی محفل میں ہوا تب باریاب





سکندر ہوں تلاش آبِ حیواں روز کرتا ہوں
ابھی نقش ونگارِ زندگی میں رنگ بھرتا ہوں

ہوئے داخل شہیدوں میں لگا کر سب لہو آخر
میں اپنی لاش رستے سے ہٹانے تک سے ڈرتا ہوں

پرائی آگ اگر ہوتی تو کب کی جل بجھی ہوتی
میں ہنستے کھیلتے موجِ حوادث سے گزرتا ہوں

یقیناً موت کے ہر عکس پر وہ خاک ڈالے گا
دعا سے جس کی میں اب تک نہ جیتا ہوں نہ مرتا ہوں

کبھی میری طلب کچے گھڑی پر پار اُترتی ہے
کبھی محفوظ کشتی میں سفر کرنے سے ڈرتا ہوں

تمہارا اِذن ہو حاصل تو دریا راستہ دیں گے
جہاں فرعون ڈوبا تھا وہیں پر پار اُترتا ہوں

فریدؔ اُس کی طلب اکثر جھنکاتی ہے کنویں مجھ کو
وہ چہرہ جس کی چاہت میں، میں کیا کیا کر گزرتا ہوں





دورانِ گفتگو نیا پہلو نکل پڑے
میں آپ کہنا چاہوں مگر تو نکل پڑے

اب تیرہ روزگار کسے ہم نوا کریں
دن کی تلاش میں سبھی جگنو نکل پڑے

وہ موجۂ گلاب جو گلشن میں کھو گیا
ممکن ہے زیرِ سایۂ گیسو نکل پڑے

جب یاد آئیں اپنی تساہل پسندیاں
بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے

صیقل پسند بھولتے جاتے تھے اپنا آپ
خود کو تلاش کرنے لبِ جو نکل پڑے

تیری گلی میں سیکھا ہے درسِ یگانگی
اب منہ سے کیسے حرف من و تو نکل پڑے

آئی ہے یاد تیرہ نصیبوں کی اُس لیے
لے کر چراغِ چہرۂ نیکو نکل پڑے

جو تیر اس نظر کا ہوا تھا خطا کبھی
وہ کیوں نہ میرے دل میں ترازو نکل پڑے

غم کے سوا فریدؔ یہاں اب بچے گا کیا
خوشیاں وہ جھاڑنے لئے جھاڑو نکل پڑے





قلب ونظر کا مسئلہ یوں حل طلب بھی ہے
اے دل تری تباہی کچھ اپنا سبب بھی ہے

واپس نہ آسکو گے جو گھر سے نکل پڑے
راہیں شکستہ ہی نہیں تاریک شب بھی ہے

ہر شب جلا کے رکھتا ہوں دہلیز پر چراغ
شاید کہ لوٹ آؤ گے اُمید اب بھی ہے





کئی دنوں سے محبتوں کی فضا ہے ناخوشگوار جاناں
نظر نظر میں ہوس ہے باقی نہ نکلا دل کا غبار جاناں

میں منہدم خواہشوں کا ملبہ لئے پھرا ہوں تمام جگ میں
اس اک خلش نے کیا ہے غارت متاعِ صبر وقرار جاناں

وجود میرا بکھر چکا ہے خرد کے گھر سے جنوں کے در تک
قدم قدم پر ہوں دفن میں ہی جگہ جگہ ہے مزار جاناں

میں شوق ورغبت کی دلدلوں میں پھنسا ہوا ہوں، میں پاگل ہوں
ابھی تلک بھی سمجھ رہا ہوں میں جبر کو اختیار جاناں

میں ایک سایہ ہوں شائبوں کا کہ واہمہ ہوں میں ذائقوں کا
کہاں تلک یہ چھپاؤں خود سے ہے شوقِ ناپائدار جاناں

عجیب منطق مری طلب کی کبھی تعلق کبھی گریزاں
یہ شوقِ خستہ کرے گا کب تک اسی پہ انحصار جاناں

کمند ڈالی اُسی ادا نے لگا ہے مژگاں کا تیر دل پر
شکار کرنے چلا تھا لیکن ہوں خود ہی شکار جاناں

مکین دِلّی ہوا ہے شہپر[1] گیا ہے اسعدؔ[2] بھی اب بدایوں
فریدؔ تنہا گزارتا ہے اب اپنے لیل ونہار جاناں



۱۔ شہپر رسول ۲۔ اسعدؔ بدایونی



کشتیٔ جاں ہوگئی بے بادباں
اے ہَوا اس طور مت لے امتحان
آؤ کھیلیں ہم کبھی مل کر دھمال
جو نہ ہونے کو تھا وہ ہوگا یہاں
کچھ ترحّم چاہیے اے اَبر تر
جل گئیں میرے وطن کی کھیتیاں
خود کو بھی بھولا ہوں اب کی بار میں
تجھ کو بھی اب یاد آؤں گا کہاں
یہ نہیں پہچان سکتا ہوں میں اب
تھا کہاں پر شہر میں میرا مکاں
جو اُٹھا لایا ہوں کوئے یار سے
سر پہ ہے اب تک وہی بارِ گراں
بچ نکلنے کا کوئی امکاں نہیں
چاروں جانب ہے حصارِ دشمناں
ہوں اسیرِ دامِ الفت اے فریدؔ
من نمی دانم فلاں ابن فلاں





کسی پہ یوں نہ کرو اعتبار میری طرح
لٹا کے بیٹھو گے صبر وقرار میری طرح

سمندروں سے بھی لوٹے جو تشنگی لے کر
سمیٹتے ہیں وہ اب تک پھوار میری طرح

ابھی تو ہوتی ہیں سرگوشیاں پسِ دیوار
ابھی نہ کرنا ستارے شمار میری طرح

بگولہ بن کے اُڑا خواہشوں کے صحرا میں
ٹھہر گیا تو فقط تھا غبار میری طرح

انہیں کے سایوں میں اب سر جھکا کے چلتا ہوں
اُگا گیا تھا جو سرو و چغار میری طرح





تمنّا اپنی اُن پر آشکارا کر رہا ہوں میں
جو پہلے کر چکا ہوں اب دوبارہ کر رہا ہوں میں

شکستِ آرزو، عرضِ تمنّا ،شوقِ لاحاصل
تری خاطر تو یہ سب کچھ گوارا کر رہا ہوں میں

قفس میں جی بہلنے کے لئے وہ پھول رکھ آئے
ہجومِ یاس میں جن پر گزارا کر رہا ہوں میں

غرض اُس چیز سے مجھ کو نہیں میری نہ جو ہوگی
یہ باعث ہے کہ دُنیا سے کنارا کر رہا ہوں میں

میں کھل کر کہہ نہیں سکتا نیازِ عشق کی باتیں
فقط اُن کی طرف بس اک اشارہ کر رہا ہوں میں

مرے سر پر ہے باقی ایک سایہ میرے ماضی کا
سنبھل کر عصرِ حاضر کا نظارا کر رہا ہوں میں

فریدؔ اک دن سہارے زندگی کے ٹوٹ جائینگے
سبب یہ ہے کہ خود کو بے سہارا کر رہا ہوں میں





وہ مرا یار مہرباں جس کی مثال اب نہیں
اس کا خیال ہے مگر اپنا خیال اب نہیں

شوق کا بحرِ بے کراں، محوِ سکوت جاوداں
اُس میں کوئی نہ جوش اب اس میں اُبال اب نہیں

غم کی زمیں پہ آسماں باقی رہا نہ مہرباں
دل کی یہ سوگواریاں روبہ زوال اب نہیں

اب نہ حریم ناز سے ہوگا طلوع آفتاب
قرب جمال تو گیا لطفِ وصال اب نہیں

دور ہے رہ حبیب کی بات یہ ہے نصیب کی
جینا محال ہوگیا مرنا محال اب نہیں

رقص کناں ہے واں ہوس اِس پہ رہی نہ دسترس
حسنِ ملیح ساکنِ شہر جمال اب نہیں

تیرے کرم پہ جی رہی کب سے ہے میری کج روی
کوئی جواب اب نہیں کوئی سوال اب نہیں

لے کے نئی نئی غزل آہی گئے فریدؔ اب
سن اے چراغِ انجمن تیرا زوال اب نہیں





سینے پہ بوجھ، سانس رُکی دل بھی کچھ ہے تنگ
برپا تمام جسم میں ہے اب کے ایک جنگ
اکثر دکھا رہا تھا مجھے آسماں کے خواب
آخر گیا زمیں پہ پٹک کر وہ بے درنگ
رنگوں کے اژدھام میں تحلیل نہ ہو جاؤں
حالات بدلے جاتے ہیں گرگٹ کی طرح رنگ
ایسے بھی حادثات وفا میں گزر گئے
پھولوں میں جب لپیٹ کے بھیجے ہیں اُس نے سنگ
ہر شہر ہر نگر مری منزل بنا گیا
آزاد مجھ کو کر گیا جیسے کئی پتنگ
گوہر مراد کا کہیں کھو کر نہ لوٹنا
ہر جوئے آب ہوتی نہیں خالی از نہنگ
شاید تیری نگاہ سے گرنے لگا ہوں میں
اپنے وجود سے مجھے آنے لگا ہے ننگ
اہل کرم کے طور سے بیگانہ مت کہو
دیکھے ہیں میں نے چشم مروّت کے سبھی رنگ
شاید ڈبو کے جائیں گی طغیانیاں فریدؔ
خالی نہیں فساد سے دل کی کوئی ترنگ





خستہ جاں پابند کارِ رائیگاں ہونے کو ہے
جمع خار و خس برائے آشیاں ہونے کو ہے

زندگی کی حیرتوں میں پھر اضافہ ہو گیا
تھی جو ہونے کی توقع وہ کہاں ہونے کو ہے

سونپ کر جس کو چلا تھا میں نگہ داری کا کام
وہ بھی محوِ سازشِ تیر و کماں ہونے کو ہے

واپسی کے راستے بھی ہو گئے مسدود سب
اور مرے جی کو بھی احساسِ زیاں ہونے کو ہے

ساحلوں سے باندھ اپنی کشتیاں تو بھی فریدؔ
پھر سے برگشتہ ہوائے بادباں ہونے کو ہے





فرصت جو ملے خود سے ملاقات بھی ہوگی
دیوار کے سایوں سے نئی بات بھی ہوگی

پیاسا جو پلٹ آؤں وہ ہے اپنا مقدّر
طے مجھ سے یوں تو منزلِ ظلمات بھی ہوگی

ہاری ہوئی سرحد پہ ڈٹا اِس لئے ہوں میں
جیتے ہوئے دشمن کی کبھی مات بھی ہوگی

قطعہ

اس درجہ بڑھیں گے کبھی اخلاص کے رشتے
جو بات نہ کہنے کی ہے وہ بات بھی ہوگی

ناچے گا کبھی مور ترستے ہوئے دل کا
اک دن ترے الطاف کی برسات بھی ہوگی





اسیر پنجۂ رنج وتعب میں رہتا ہوں
میں تجھ سے دور بھی تیری طلب میں رہتا ہوں

بھلا رہا ہوں اُسے جس کو یاد رکھنا ہے
یہ کس بہانے غمِ بے کسب[1] میں رہتا ہوں

میں تب سے اپنے لئے گھر نہیں بناتا ہوں
کھلا یہ جب سے کہ دارالحرب[1] میں رہتا ہوں

تمام دن وہ دعا دے رہے ہیں جینے کی
میں اپنے قتل پہ آمادہ شب میں رہتا ہوں

رہِ حیات میں زادِ سفر تیری یادیں
میں تجھ سے دور سہی دور کب میں رہتا ہوں

ہر ایک ظرف کے وہ احتساب میں ہے فریدؔ
یہ اور بات کہ اہلِ نسب میں رہتا ہوں

1۔ شعری ضرورت کے تحت وتد مجموع گردانا گیا ہے۔ (فریدؔ)



بیتاب ، بے قرار ، مزاجاً کرخت تھا
شاید مرا رفیق بھی اک تیرہ بخت تھا

تیار تھا نہ کوئی بھی ہونے کو ہمسفر
باندھے ہوئے اگرچہ سفر کا وہ رخت تھا

کرتا نہ کیوں میں دعوتِ مژگان کا اہتمام
دل خون خون تھا تو جگر لخت لخت تھا

تازہ ہوا سے رشتۂ موسم تو تھا ضرور
بے برگ و بار دل کا مگر ہر درخت تھا

بھرتا وہ کس طرح مرا کشکول مہربان
اُس کو یہ ہے خبر میں سرِتاج و تخت تھا

کیا بات ہے فریدؔ تجھے چپ ہے کیوں لگی
لوگوں میں نامور تو یہاں جانِ سخت تھا





شکستہ پیکروں میں رنگ بھر آ گیا ہوگا
ہوا کے ایک جھونکے سے بکھرنا آ گیا ہوگا

سنا ہے ہر تقاضا نو بہ نو سانچہ بدلتا ہے
جو کرنے کی نہ تھی خواہش وہ کرنا آ گیا ہوگا

ہنر سب زیست کرنے کے وہ یکسر بھول بیٹھا ہے
نہ جینا آ گیا ہوگا نہ مرنا آ گیا ہوگا

بڑا چالاک ہے وہ شخص ہر گُر جانتا ہے وہ
بھرے چوپال پر اس کو مکرنا آ گیا ہوگا

سنا تھا میں نے وہ پانی پہ چل کر پار اُترے گا
سفینے ڈوبتے دیکھے ہیں ، ڈرنا آ گیا ہوگا





اُجاڑ بستی نگر ہے ویراں
مکین برباد گھر ہے ویراں

اُداس شام اور سحر ہے ویراں
بہت دنوں سے سفر ہے ویراں

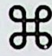
یہ اُن دیاروں سے پوچھ لینا
جہاں پہ ایک اک بشر ہے ویراں

لباس ہے سلوٹوں سے عاری
پہ دل کا تیور مگر ہے ویراں

شبیہِ خواب و خیال کی ہے
اُداس چہرہ نظر ہے ویراں

فریدؔ خوابوں کے قافلے کا
ہر اک شریکِ سفر ہے ویران





نیندوں کا قحط خواب کی ارزانی بڑھ گئی
تجھ سے بچھڑ کے اور پریشانی بڑھ گئی

جب سے چراغ یاد بجھا بادِ بے لحاظ
جینا محال ہوگیا ویرانی بڑھ گئی

چاہِ حیات پر جو سکندر پہنچ گیا
خستہ تنوں کو دیکھ کے حیرانی بڑھ گئی

شاہِ زمن کو دستِ ہنرور ہوا سپرد
آدابِ آب زر سے تن آسانی بڑھ گئی

ہر کاغذی بدن کو ہے دعوائے رنگ وبو
ذوقِ ریا میں طرزِ گل افشانی بڑھ گئی

اُس مضطرب مزاج سے حصہ طلب کرو
ہنگامۂ حیات کی یکسانی بڑھ گئی

جب سے یہاں پہ رسم لباسوں کی چل پڑی
تب سے وہاں پہ خواہشِ عریانی بڑھ گئی

طالب نہ داد کا ہے ترا اب سخن فریدؔ
حد سے صریرِ خامۂ لافانی بڑھ گئی





جب حدِ ادراک پھاندوں بے کراں کہنا مجھے
خالی از اندیشۂ سود و زیاں کہنا مجھے

ایک سے لگنے لگے ہیں مجھ کو سارے ہی دیار
نکہتِ گل کی طرح اب لا مکاں کہنا مجھے

سوکھی دھرتی کی زباں پر رکھ کے حرفِ العطش
کس طرح جانا ہے اے ابر رواں کہنا مجھے

مت سمجھ میری خموشی کو مری مجبوریاں
بھا گیا کب تیرے منہ سے داستاں کہنا مجھے

سایہ سایہ جمع کرنا روز کا معمول ہے
وحشتوں کے شہر کا اک ترجماں کہنا مجھے

جب حصارِ رنگ سے نکلوں میں آگے اے فریدؔ
چاہتوں کے لفظ و معنی کا بیاں کہنا مجھے





نفاستوں کا لبادہ اُتار کر آیا
برنگِ بوئے چمن خود کو ہار کر آیا

تجھے یقین نہیں ہے، تواپنے آپ سے پوچھ
بچا کے لایا جسے بھی وہ وار کر آیا

وہ حق پرست نہ تھا عاقبت کا سودائی
ہوائے دہر پہ مجھ کو سوار کر آیا

ملا بھی کیا اُسے جزیاس و درد و ناکامی
گلی گلی میں تجھے جو پکار کر آیا

کبھی یہ پوچھنا فرصت میں موجِ طوفاں سے
وہ کس طرح سے سمندر کو پار کر آیا

میں گرد گرد صداؤں کے آسرے پہ فریدؔ
زیاں رسید بگولے شمار کر آیا





بنے بنائے سے رستوں کو ڈھا گئی ہے ہَوا
تمام نقشِ کفِ پا مٹا گئی ہے ہَوا

کہیں پہ سبزہ نہ کوئی نشان پانی کا
نجانے لے کے کہاں مجھ کو آ گئی ہے ہَوا

کہاں پہ ٹوٹ گیا ہوں مجھے یہ فکر نہیں
میں سوچتا ہوں کہاں سے گرا گئی ہے ہَوا

کہاں سے مانگ کے لاؤں ضیا میں گھر کے لئے
سبھی گھروں کے دیئے جب بجھا گئی ہے ہَوا

خیال و خواب کے تتلی پروں کو روتے ہیں
اُداس صحن میں فتنے جگا گئی ہے ہَوا





دہرا رہے ہو گزرے ہوئے واقعات پھر
غارت کرو نہ میرا سکونِ حیات پھر

اے وقت آ کے پونچھ اب اشک رواں کی دھار
مجھ کو رلا رہے ہیں وہی حادثات پھر

ریگِ ہوس سے بھرتا ہوں دامن اُمید کا
ملنے سے رہ گئی ہے تمنا کی رات پھر

شاید کہ زندگی کو ہے مجھ سے کوئی گلہ
تاریک کیوں نظر میں ہوئی کائنات پھر

اس بار اُس سے مل کے میں حیران پھر ہوا
اس بار دے گیا وہ غمِ بے ثبات پھر





ہر راہ میں لٹایا سامان زندگی کا
نکلا نہ کوئی اب تک ارمان زندگی کا

وہ ریت کے گھروندے اب ڈھونڈھ لوں کہاں پر
ڈھا کر چلا ہے جن کو طوفان زندگی کا

آخر اُسے بھی پایا ہارے ہوؤں میں میں نے
جیتا ہوا تھا جس نے میدان زندگی کا

مجھ کو دعا یہ دے کر اک شخص جا چکا ہے
آسان نہ چھوٹنا ہو دامان زندگی کا

اک راہ زن کو میں نے جب ہم سفر بنایا
تب ہوگیا سفر کچھ آسان زندگی کا

کم ظرف محسنوں نے کہلا یہ مجھ کو بھیجا
ہر معرکہ ہے اب کے گھمسان زندگی کا





عہدِ جنوں کے روز و شب یوں بھی کبھی گزرنا
مارے تجھے جو کوئی سنگ تو تُو بھی اُس پہ مارنا

راہِ طلب میں گر کہیں درد کی اک کرن ملے
پلکوں کی رہ گزار سے دل میں اُسے اُتارنا

محوِ سخن کہ خود سے رہ اور یقینِ صبح رکھ
زلفِ شبِ فراق کو یوں بھی کبھی سنوارنا

نیند کے قافلے چلو ڈھونڈ لیں پھر نگر نگر
خوابوں کے عکس عکس کو جاگتے ہیں پکارنا

چاہے اگر یہ دل ترا پھول نئے ہوں باغ میں
پچھلی رُتوں کے قرضے تم پہلے سبھی اُتارنا





بوئے گل محوِ بے کرانی ہے
رنگ موسم کا داستانی ہے

بارشِ سنگ وادیوں پہ ہوئی
فصل پر قہر آسمانی ہے

اُس جگہ تم نے مجھ کو چھوڑ دیا
جس جگہ سبزہ ہے نہ پانی ہے

اب سلامت مکاں ہے نہ مکیں
کیا یہی تیری پاسبانی ہے

جانے کس سمت لے چلے گی مجھے
اِک ہَوا ساتھ بادبانی ہے

اب تو کم کم ہی بولتے ہو فریدؔ
جانے کیا تم نے دل میں ٹھانی ہے

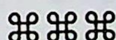




پُر کیف ساعتوں کے حسیں خواب لے گیا
صبر و شکیب نیند کے اسباب لے گیا

یہ حادثہ بھی ہوگا چمن میں نہ تھا یقیں
پھولوں کا رنگ اوس کا سیلاب لے گیا

اُس رہ گزر میں کس نے دیا ہے کسی کا ساتھ
جس سمت مجھ کو یہ دلِ بیتاب لے گیا



وہ قہقہوں سے نبھاتا ہے رسم زندہ دلی
ہر ایک شخص کو وہ خوش نصیب لگتا ہے





خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے ایک اک دکاں پر

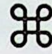
کرایہ دار سے ہشیار رہنا
کہیں قابض نہ ہوجائے مکاں پر

تہہِ دیوار سائے گم ہوئے سب
بہت حیران ہوں اِس داستاں پر

ہوا تو لے اُڑی برگ و شجر تک
یہ کیسا وقت آیا گلستان پر

وہ اُس کی خواہش تسخیر اللہ!
کمندیں ڈالتا ہے کہکشاں پر





آندھی چلی درخت سبھی اوندھے منہ گرے
سایوں کی جستجو میں مگر اِک فقیر تھا

شاید بغیر سیج وہ سویا تھا رات بھر
اُس کے تمام جسم پہ نقشِ حصیر تھا

نکلا تھا گھر سے ڈھونڈنے وہ اپنے آپ کو
شاید یہی گناہِ گناہ کبیر تھا



صحرائے خشت وسنگ میں آواز کس کو دوں
شہرِ سکوں میں بڑھنے لگا اضطراب سا





بطرزِ خاص ستم جو حنا حنا سا لگا
اُسی سے درد کا رشتہ سجا سجا سا لگا

سلگتے خواب خریدے ہیں نیند کے بدلے
یہ کاروبار پرانا نیا نیا سا لگا

اُلجھ گئے ہیں پرندوں کے شاخ شاخ سے پَر
نئی فضاؤں کا لہجہ سزا سزا سا لگا

وہ نقش لوحِ وفا پھر بھی جاوداں نہ ہوا
اگرچہ حرفِ جدائی مٹا مٹا سا لگا

فضول درد چھپانے کی کوششیں تھیں فریدؔ
زبانِ حال سے سب کچھ کہا کہا سا لگا





اُس بے وفا سے اب کے محبت نہیں رہی
وہ دِل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی

ویرانیٔ حیات کا یہ کیا مقام ہے !
لگتا ہے مجھ کو تیری ضرورت نہیں رہی

آگے کی راہ گھیر لی سرکش ہواؤں نے
واپس بھی لوٹ جانے کی صورت نہیں رہی

رکھتا ہوں اب تو خود سے حریفانہ کشمکش
اپنوں سے کوئی وجہ کدورت نہیں رہی

وحشت نے آ لیا ہے در و بام کو فریدؔ
کس سے کہوں کہ گھر کی وہ حالت نہیں رہی





صعوبتِ شب غم سے بہت نڈھال ہوئی
ترے بغیر مری زندگی محال ہوئی

جہاں قریب سبھی کچھ ہے فرصتوں کے سوا
اُسی مقام پہ اب وہ شریک حال ہوئی

ابھی تلک ہے سرہ گزار خاک بسر
وہ آرزو جو کشاکش میں پائمال ہوئی

مثال موجِ بلایاں چلے ہے موجِ جنوں
تری گلی بھی زمانے میں بے مثال ہوئی

خوشی کی ایک رمق وہ جو دل میں باقی تھی
ہزار غم کے مقابل میں بڑھ کے ڈھال ہوئی





تعلقات کشیدہ وہ جوڑنے لگا
اسی نگر میں مجھے لا کے چھوڑنے لگا

بطورِ تحفہ ملی سیج زرد پتوں کی
لہو جو اپنا گلستاں میں چھوڑنے نکلا

جنوں کا جس کو سہارا بفیضِ عشق ملا
کلائیاں وہ خرد کی مروڑنے نکلا

حصارِ وقت نے خود اس کو گھیر رکھا ہے
میں کس سے رشتۂ اخلاص جوڑنے نکلا

یہ کیا کہ فتنہ کوئی راستوں میں ساتھ لئے؟
تمام شہر کو پاگل جھنجھوڑنے نکلا

جو بے گناہ پرندوں کو قید کرتا تھا
قفس وہ آج سرِ راہ توڑنے نکلا





نہ پوچھو کس طرح اب تک جلا ہوں
ہوا کے دوش پر میں اک دِیا ہوں

خفا مجھ سے ہیں سارے سونے والے
خطا میری یہی ہے جاگتا ہوں

کھڑا رستے میں ہوں پلکیں بچھائے
تری آمد کے چرچے سن رہا ہوں

زمانہ ہی نہیں واقف ہے مجھ سے
زمانے سے مگر میں آشنا ہوں

کسی دامن نہ آنچل ہی کا سایہ
ہواؤں کس نگر میں آگیا ہوں

مجھے غم ہے اگر تو بس یہی ہے
کہ اپنوں ہی کے ہاتھوں لٹ گیا ہوں

یہ دُنیا پڑ گئی ہے میرے پیچھے
میں بگ ٹٹ اس لئے ہی دوڑتا ہوں





تاریک مناظر کو بدلتا ہوں اکیلا
مرقد کا دیا بن کے میں جلتا ہوا اکیلا

مانا کہ مرے پاؤں لہو رنگ ہوئے ہیں
حالات کے کانٹوں کو مسلتا ہوں اکیلا

غالب نہیں احساس بھی پس پائی کا مجھ پر
ٹھوکر سے جو گرتا ہوں سنبھلتا ہوں اکیلا

ہر شام تھکن ساتھ لیے لوٹتا ہوں گھر
ہر صبح کسے ڈھونڈنے چلتا اکیلا

پر کیف فضاؤں سے فریدؔ اب یہ کہے کون
تپتے ہوئے صحراؤں میں پلتا ہوں اکیلا





سانس لینا عذاب ہے بابا
لمحہ لمحہ خراب ہے بابا

پھر وہی مرحلہ ہے پیش نظر
پھر وہی اضطراب ہے بابا

وہ کریدے ہے راکھ چولھے کی
اور نگاہوں میں خواب ہے بابا

میں کہ مثل غبار صحرا ہوں
تو سراسر سحاب ہے بابا

وہ جو دھونی رمائے بیٹھا ہے
کوئی پوچھے جواب ہے بابا





لہولہان تمناؤں کا چمن ہے ابھی
تمہاری یاد کے پہلو میں بانکپن ہیں ابھی

نجانے کون سا الزام لوگ دیں گے اب
نظر نظر میں تقاضوں بھری چبھن ہے ابھی

تلاش کرتا ہوں میں خود کو گھر کے گوشوں میں
تمام جسم میں بے نام سی تھکن ہے ابھی

کدھر کو جائے گی دم لینے جنگلوں کی ہوا
چہار سمت درختوں سے اک گھٹن ہے ابھی

بدن کے داغ فریدؔ اب چھپیں تو کیسے چھپیں
کہ تار تار سبھی میرا پیرہن ہے ابھی





دیوار کیا ایک در نہ رکھا
اب شہر میں کوئی گھر نہ رکھا

اشجار ہوا نے رکھے باقی
شاخوں پہ کوئی ثمر نہ رکھا

کرتب وہ ہوا نے کر دکھایا
فانوس چراغ پر نہ رکھا





رنج کی بات کرر ہے ہیں لوگ
حد سے آگے گزر رہے ہیں لوگ

کھوج میں موتیوں کے نکلے تھے
خاک دامن بھر رہے ہیں لوگ

چھوڑ جاتے ہیں دل میں گہرا گھاؤ
چھب دِکھا کے گزر رہے ہیں لوگ

سبز صحرا میں منتظر رکھ کر
وعدہ کرکے مکر رہے ہیں لوگ

جانے ہو کر کہاں سے آیا دِن
اپنے سارے سے ڈر رہے ہیں لوگ





داؤ عدو وہ مار گئے ہیں
جیتی بازی ہار گئے ہیں

میرا سفینہ بیچ بھنور میں
تیرنے والے پار گئے ہیں

کند تھے اپنے تیغ و تبر ہی
خالی سارے وار گئے ہیں

طالبِ آب ہوئے تھے پیاسے
تیر دہن پر مار گئے ہیں





وہ رہ گزارِ تمنا سے چوٹ کھا کے گیا
سکوتِ وشت میں اِک شور و غل مچا کے گیا

زمیں پہ چاند ستارے بکھیرنے والا!
نجانے کیوں مرے گھر کا دیا بجھا کے گیا

شریر بچوں نے نوچے تھے تتلیوں کے پَر
اِسی سے ملتی کہانی کوئی سنا کے گیا

اُداسیوں کے پرندے منڈیر پر رکھ کر
خموشیوں کے شجر صحن میں اُگا کے گیا

گزر کے اَبر کی صورت وہ بستیوں سے فریدؔ
نظر نظر میں عجب تشنگی بسا کے گیا





سانس رُکے ہے جی مچلے ہے حال ہمارا اب کیا ہوگا
دل کی باتیں کس کو سناؤں بوجھ یہ کیسے ہلکا ہوگا

ہم سے بے زَر لوگ کہاں ہیں وہ تو دھنی کہلاتے ہیں
مال ومتاع کے لُٹ جانے کا جن کو یارو خدشہ ہوگا

جیون اُجڑا، راتیں اُجڑیں، دِن بھی سونے سونے ہیں
روگ لگا ہے جی کو ایسا جو نہ کبھی بھی اچھا ہوگا

ڈھونڈ رہا تھا ان کو شاید گھر کے اُجڑے گوشوں میں
سود وزیاں کا زینہ چڑھتے جن لمحوں کو کھویا ہوگا

گھر میں اتنے فتنے جگے تھے خود کو یاد نہ آیا ہوں
میرے بارے اب کے ساوَن تم نے کیا کیا سوچا ہوگا

کچھ بھی نہیں ہے، جز نقالی بات بنے گی کیسے فریدؔ
کاری چوٹ لگے جب دل پر میر کا جیسا لہجہ ہوگا





سلگ رہا ہوں اِسی تجسّس میں چاہنے کے اصول کیا تھے
تمہارے بالوں میں کل بتاؤ گلاب کے سرخ پھول کیا تھے

تھکا تھکا ایک اِک مسافر کہاں کی منزل کدھر کے راہی
بچھڑ کے خود سے اگر ملے ہیں تو پھر یہ اتنے ملول کیا تھے

یہ حال ہے دِل گرفتگی کا کوئی ہے غمگیں کوئی فسردہ
اُتر گیا ہے دماغ و دِل سے مسافتوں کے اصول کیا تھے

کبھی متاعِ چمن وہی تھے کبھی تھے سامانِ صد بہاراں
نئی فضا نے کیے ہیں بے پر پرندے ورنہ فضول کیا تھے





فتنۂ ماہ و سال ہے شاید
شہرِ دل پائمال ہے شاید

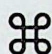
عمر گذری ہے جس کو سلجھاتے
دل کا اُلجھا سوال ہے شاید

قریہ در قریہ ڈھونڈتا ہوں جسے
گم شدہ اِک خیال ہے شاید

مجھ سے ملنے یہ کون آیا ہے ؟
لمحۂ لازوال ہے شاید

گھر کا دروازہ جس سے بند ہوا
کسی مکڑی کا جال ہے شاید





گم گشتگی پہ مائل فریاد بھی نہیں
کن راستوں سے آئے یہاں یاد بھی نہیں

واضح معاملات ہوں شب خوں کے کس طرح
کوئی نشان ریت پر آباد بھی ہوگا

جلتے نگر کا سب نے تماشا کیا مگر
میرے سوا کسی کو وہ دن یاد بھی نہیں

دن زندگی کے ایسے گزرتے ہیں اے فریدؔ
دل شاد اگر نہیں ہے تو ناشاد بھی نہیں





بوجھل ہیں آنکھ نیند سے گھر سوچنے لگے
شب کس جگہ کہاں ہو سحر سوچنے لگے

اس آرزو میں روتے ہوئے عمر کٹ گئی
کب معتبر ہو دیدۂ تر سوچنے لگے

دامن میں کیوں مرے وہ خس و خار بھر گئے
اوروں کو کیوں دیئے ہیں ثمر سوچنے لگے

اَن دیکھی وادیوں کا جو درپیش ہے سفر
کیسے ملے گی راہ گزر سوچنے لگے

شعلے لئے بہار جو آئی تو ہم فریدؔ
کیا ہوگا رنگ و بو کا اثر سوچنے لگے





آشنائی کا صلہ عیار سے کیا مانگتا
سایہ اب ٹوٹی ہوئی دیوار سے کیا مانگتا

ٹولیاں وہ پنچھیوں کی رنگ رنگ اور پُرکشش
اُڑ گئیں کس سمت وہ اشجار سے کیا مانگتا

چند مہمل لفظ تھے کس سے وہ ہوتا ہمکلام
گونگا شہری پھر لبِ اظہار سے کیا مانگتا

دھوپ اُتری بام و دَر سے راستے سونے ہوئے
کیا ہو انجام سفر رفتار سے کیا مانگتا

کیوں بلندی کے تصوّر کو نہ چھوڑ آتا فریدؔ
واقفِ معیار تھا کردار سے کیا مانگتا





خوں گشتہ خواہشوں کا وہ اثبات کر گیا
اچھا ہوا کہ شکوۂ حالات کرگیا

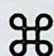
سمجھا بُجھا کے خود کو وہ لایا ہے راہ پر
دُنیا سمجھ رہی ہے کرامات کر گیا

کشکول ہاتھ میں لئے بابا بھی چل دیا
بستی میں کون پاسِ روایات کر گیا

بستی کے سارے لوگ گھروں سے نکل پڑے
یہ کون زلزلوں کی یہاں بات کرگیا

اے روشنئ طبع ذرا ان کا ساتھ دے
برباد جن کو شوقِ ملاقات کرگیا





حرفِ امکاں منجمد ہے پتھروں کے درمیاں
اِک زمرّد پوش منظر بنجروں کے درمیاں

چل دیا کس سمت وہ اسپِ ضیاء کا شہسوار
کرکے مجھ کو قید تیرہ منظروں کے درمیاں

بھول بیٹھا ہوں میں اَب خارہ شگافی کا مزاج
چین آتا ہے مجھے شیشہ گروں کے درمیاں

بے بسی کی وسعتیں شاید سمجھ میں آگئی
ڈھونڈتا ہوں اَب میں گھر اُجڑے گھروں کے درمیاں

ٹوٹتی دیوار کا سایہ بھی آخر چھن گیا
زندگی سُستا رہی ہے خنجروں کے درمیاں





شجر شجر کو رہینِ عذاب کہلوں گا
میں بھاگتے ہوئے سایوں سے خواب کہلوں گا

بچا سکوں تو بچا لوں انا گزیدہ وجود
امیرِ شہر کو خانہ خراب کہلوں گا

ورق ورق یہ حقیقت غریقِ آب کروں ؟
کہ بے بھروسہ ہے دِل کی کتاب کہلوں گا

سڑک سڑک نہ بچھا یوں وجود خستہ مرا
بچھڑنے والے کسے ہم رکاب کہلوں گا

خزاں رسیدہ کلی ہی سہی جو ہاتھ لگے
میں خود فریب ہوں تازہ گلاب کہلوں گا





بادِ وباراں جو بے پناہ ہوئے
نو دمیدہ شجر تباہ ہوئے

جن کی زنبیل میں ہیں شمس و قمر
ساتھ ہم اُن کے گاہ گاہ ہوئے

چند لمحات تھے جو حاصلِ زیست
وہ سبھی صرفِ اشک و آہ ہوئے

ہم کہ محروم ہیں چراغ سے بھی
وہ کہ سورج کے بادشاہ ہوئے

شب کو دیکھا تھا خواب میں ہم نے
مشتعل سائے داد خواہ ہوئے





تجھ کو کیا دوں گا نہ خوشبو ہے نہ شبنم اور نہ رنگ
میرے دامن میں بجز موجِ ہوا کچھ بھی نہیں

بس کہ اپنوں ہی کے ہاتھوں سے ہوا ہے میرا قتل
لوگ کہتے ہیں کہ ''تیرا خوں بہا'' کچھ اور نہیں

بادلوں کی دوستی میں لوگ پیاسے رہ گئے
آتے جاتے موسموں سے اَب گلہ کچھ بھی نہیں

پرشکستہ ایک طائر سوچتا ہے دیر سے
دام و دانہ کے سوا باقی بچا کچھ بھی نہیں





وہ موسمی پرندہ نہ لوٹا ابھی تلک
ہے فرشِ راہ چشمِ تمنا ابھی تلک

جس کی طلب مجھی سے بچھڑ کر چلی مجھے[1]
کچھ بھی لگی نہ ہاتھ وہ دنیا ابھی تلک

ہر سنگِ میل دیتا ہے اذنِ سفر مجھے
شاید اِسی سبب سے نہ ٹھہرا ابھی تلک

---

[1] ...... علم کز تو ترا نہ بستاند
جہل زاں علم بہ بود بسیار
(حکیم سنائیؔ)



نظمیں



جنوں کے پاؤں تلے چڑھتی سیڑھیاں نہ نکال
حصارِ باغ سے خوش رنگ تتلیاں نہ نکال

کہیں نہ راہ میں اُلجھن اُنہیں سے بڑھ جائے
گھروں سے ہاتھ میں خوابوں کی سونٹیاں نہ نکال

نہ جانے اہل ہوس کس نظر سے دیکھیں انہیں
بغیر پردہ تمنّا کی بیٹیاں نہ نکال

علاج درد میں اتنا نہ مر تو لذت پر
چبھی ہیں پاؤں میں تیرے جو سوئیاں نہ نکال

فساد ہو نہ بپا پھر سکوں کے ساحل پر
اداسیوں کے سمندر سے مچھلیاں نہ نکال

فریدؔ بیچ کے اپنا ضمیر سستے میں
چلی ہے رسم کہ آنگن میں لڑکیاں نہ نکال



دُعا

میں گھر سے جب بھی نکلتا تھا
میرا بستہ میرے کاندھے پر
آویزاں ہوتا تھا اس طرح
جالے میں مکڑی ہو جس طرح
میری ماں مجھے جاتے جاتے
اکثر اِس حرفِ تر سے نوازتی تھی
''جا بیٹا تجھے علم کے زیور عطا ہوں''



آتے جاتے موسموں نے میرے ماتھے پر
تیس برس کا عنوان
ثبت کیا اور کر رہا ہے
بیج سے انکھوا پھوٹا
انکھوا شاخدار قصہ سنانے لگا ہے
اور اب میں خود اپنے لئے
علم کے زیور مانگتا ہوں





۸/اکتوبر ۲۰۰۵

کئی دنوں سے عجب وحشتوں نے گھیرا ہے
کہیں نہ آکے گرے سر پہ میرے چھت اپنی
اور اسکے نیچے نہ دب جاؤں سب عیال کے ساتھ
میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں بنے جوگت اپنی

کئی دنوں سے یہاں پر ہے سلسلہ یہ دراز
زمین ہلتی ہے سب برگِ خشک کی مانند
نگلتی جاتی ہے پیہم قوی جوانوں کو
مٹا رہی ہے جہاں بھر سے خاندانوں کو
ہر ایک شئے کا یہاں انہدام ہوتا ہے
ہوا نہ آج تلک جو وہ کام ہوتا ہے
چنار ناچتے ہیں فیلِ مست کی صورت
سڑک بھی پاؤں تلے سے نکلتی جاتی ہے
مکان گرتے ہیں پیہم بس اک چھناکے سے
طیور شور مچاتے ہیں دم بہ دم لیکن
نشور ہوگیا برپا قدم قدم لیکن
میں کیا کروں کہ مرے ہاتھ میں نہیں کچھ بھی

اسپانِ من گم شدند

رواروی کے سلسلے نہ فکر خیر و ذکر غم
رواروی میں کون کس کو پوچھ لے
رواروی میں کون کس کا بوجھ لے
میں اک اکیلا آدمی میرے حریف چار سو
میں اِک اکیلا آدمی میرے حلیف
فقط انہیں پڑی ہوئی کہ لوٹ لیں
فتح گاہ سے شکستہ خور غنیم کا
مال و منال یہی ہے سب کی جستجو
میں اِک اکیلا آدمی حریفوں اور حلیفوں
کے درمیاں گرا پڑا امثالِ تیر گھڑا ہوا
تماشہ دیکھ کر خود کو کوستا
خود کو حوصلہ دینے میں منہمک
میں اک اکیلا آدمی
خود پہ طعنہ زن بھی ہوں
میں اِک اکیلا آدمی نہ ذکر غم نہ فکر آبرو مجھے
مرے رقیب چار سو
میں اِک اکیلا آدمی کسی کا ساتھ دینے سے قاصر
کہ میرے گھوڑے گم ہوئے
میں اِک اکیلا آدمی میرے حریف چار سو
میں اِک اکیلا آدمی میرے حلیف چار سو

اُداسیوں کے اختتام پر

میں سوچتا ہوں بے کسی کے نام پر
ہر ایک معرکہ کے اختتام پر

ترے تمام فیصلے ترے تمام مشورے
تری حماقتیں ترے تمام معرکے

یہ تلخ گھونٹ جام کیسے بن گئے
بلندیوں کے خواب کیسے چھن گئے

ہر ایک احتجاج نقش آب کی طرح
ہر ایک اعتمادِ عکسِ خواب کی طرح

یہ کیا مری نظر میں مجھ کو خوار کر دیا مجھے
بس ایک حرفِ حق نے بے وقار کر دیا مجھے

یہ سوچتا ہوں بے کسی کے نام پر
ہر ایک معرکہ کے اختتام پر



پڑھا ہے میں نے مقدس کتاب میں اکثر
ثمود و عاد کی باتوں کے باب میں اکثر
تباہ ہوگئے سب کارِ سہل کے حامی
غریق ہوتی ہیں قومیں بھی آب میں اکثر
خطائیں ہوتی ہیں سرزد عتاب آتا ہے
عمل کے بعد عمل کا حساب آتا ہے
کئی دنوں سے عجب کشمکش سی جاری ہے
میں دیکھتا ہوں مسلسل عذاب زا منظر
مکان اپنے زمیں بوس ہوتے جاتے ہیں
مکیں کو اپنا مکاں ہی نگلتا جاتا ہے
زمیں بھی فصل کے بدلے دھواں اُگلتی ہے
مکاں کے بدلے سڑک ہے قیام گاہ اپنی

ابھی ہے وقت کہ ہم آگہی کے پروانے
عمل سے اپنے عتابوں کو راہ میں روکیں
بچائیں اپنے عمل سے بچے کچھے ملبے
بچائیں اَشکوں سے ہی کھیلتے ہوئے بچے
ابھی ہے وقت عمل ہم رکھیں گے پیش نظر
وگرنہ یہ بھی ہے ممکن زمیں کا قہر ہمیں
عذاب ایسا کہ الفاظ گنگ کر دے گا
زمیں ہمارے لئے اور تنگ کر دے گا



ایک نظم

یاد کے اُلجھے ہوئے دھاگے سے
کوئی سرا نہ ہاتھ آتا ہے
گاہ بنتا ہوں گیت وصلت کے
گاہ فرقت کی مار کھاتا ہوں

سرد شب کے اُداس بستر پر
گامزن ہے غموں کا اِک لشکر
مار لیتا ہوں میں کبھی میدان
یہ کبھی کاٹتے ہیں میرا سر

تیری یادوں کے سلسلے ہیں دراز
مجتمع ہوگئے نشیب و فراز!



ایک نظم

اپنے والد کے نام

اے دُنیا کی خیر کے طالب
اپنے لئے بھی خیر طلب کر
تیرے گھر کے بام ودَر کو
اہلِ قریہ چاٹ رہے ہیں
ثمرِ رقابت بانٹ رہے ہیں
تیرے بازو کاٹ رہے ہیں
اے دُنیا کی خیر کے طالب
اپنے لئے خیر طلب کر



کہاں گئے وہ رات دن کدھر گئیں وہ فرصتیں
مرے قریب رہ کے بھی مرے قریب وہ نہیں
مرے رفیق وہ نہیں میرے حبیب وہ نہیں
ذرا ذرا سی اُلجھنیں ذرا ذرا سے اَڑچنیں
یہ اک وتیرہ پر نہیں گھپے چناں گھپے چنیں
اُداسیوں کے بوجھ کے تلے دبا دلِ حزیں

گئے دِنوں کی لاش کو اُٹھا کے بوڑھا گورکن
عرق عرق ہے جسم سب جبیں بھی ہے شکن شکن



حکایت حرف گر

گئے دنوں کی لاش کو اٹھا کے بوڑھا گورکن
عرق عرق ہے جسم سب جبیں بھی ہے شکن شکن
یہ مرحلہ وہی سکھائے راکھ ملنے کے ہنر
یہ مرحلہ بھی دل شکن ہے پیرہن بھی تربتر

نہ بے کراں ہوا کبھی یہ زندگی کا کارواں
نہ بے اُفق ہوا کبھی اُداسیوں کا آسماں
میں زندگی کے کھولہو میں ہوں بیل سا کسا ہوا
میں ایک جبر ہوں ہے میری زندگی بھی جبر
جو اپنے آپ سے ملوں تو ہوتی ہے مجھے گھٹن

اسے اگر ملوں کبھی تو بول دوں گا حال سب
کہ کاٹنے سے کٹ سکے ہیں کب یہ میرے روز وشب
بدل گئی یہ زندگی بدل گئے وفا کے ڈھب
محبتیں نہ نفرتیں نہ دوریاں نہ قربتیں

متفرقات



بے برگ و نوا ہوں اُسے اتنا تو پتا ہے
پھر بھی مجھے گلشن کے لئے خطرہ لکھا ہے
آسیب زدہ شہر کی وہ اُجڑی سرا ہوں
مدت سے جہاں کوئی بھی آیا نہ گیا ہے



وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں
پاؤں کی بیڑیاں بدلتا ہوں



چلو کہ خود کو بدلنے کا تجربہ کر لیں
جو آج تک نہ کیا ہے وہ حادثہ کر لیں



اپنے اطراف وجوانب سے یہ غافل ٹھہرے
اب اسی دُھن میں ہوں صبر آئے مرا دل ٹھہرے



تیرے آنگن میں پھول کھل آئے
میرے جیسا تو بدنصیب نہیں



شکوۂ جورِ ستم گر سے کیا کرتا ہوں
دل کے بجھنے کا ہواؤں سے گلہ کرتا ہوں

تضمینات

مہرِ احباب سے کترا کے گزر جانا ہے
اب تو گھر چھوڑ کے بے زادِ سفر جانا ہے



شل حوصلے ہیں دل کے زخمی ہے ہاتھ پاؤں
ارمان کا لبادہ کانٹوں میں پھنس گیا ہے



بس تجھے ہی رات دِن دیکھا کروں
اپنے بارے میں بھی کم سوچا کروں



کیسا یہ وہم دِل کا دامن پکڑ کے بیٹھا؟
کیسا یہ غم شکنجوں میں مجھ کو کس رہا ہے؟



خواہش کے باوجود میں پَل بھر نہ سو سکوں
آنکھوں کے تار میں کوئی موتی پرو سکوں
ہر بار میرے صبر کا مت لے اب امتحان
اتنا نہ بوجھ ڈال جسے میں نہ ڈھو سکوں



گھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا مجھ سا دُکھی ہے شہر میں کون
چھت پر چڑھ کر میں نے دیکھا لگی ہوئی ہے گھر گھر آگ



تضمین

براشعار فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی

بختِ خفتہ کب نکل آئیں سنور کر زیرِ پا
بے طرح کچلے ہیں اس نے ماہ واختر زیرِ پا
اس یقیں پر شاید آئیں اس سے بہتر زیرِ پا
''ہو گئے پرخوں دلِ عشاق ہو کر زیرِ پا کیا
لگا رکھا ہے ظالم تو نے خنجر زیرِ پا''

خوف سے بیٹھا زمیں پر شورِ محشر زیرِ پا
گردش ایام نے کھائی ہے ٹھوکر زیرِ پا
کر دیئے ہیں رات دن دونوں برابر زیرِ پا
''مانع رفتار ہو کیا اس کو پتھر زیرِ پا
جس نے لاکھوں روند ڈالے کاسہ سر زیرِ پا''

"مثل ماہی تیرتا جاتا ہوں راہِ شوق میں
چشمِ گریاں کی بدولت ہے سمندر زیرِ پا"

توڑ ڈالے سر پہ پتھر جبر کے، آیا نہ چین
سِل دھرے چھاتی پہ ہم نے صبر کے، آیا نہ چین
کالائے خشکی ہم رکابِ ابر کے، آیا نہ چین
"پائمالی سے نشانِ قبر کے آیا نہ چین
رکھ لیا ظالم نے میرا نام لکھ کر زیرِ پا"

میں گیا تھا اس کہ شاید پھر کھلیں گے میرے بھاگ
ایک سے ہیں سارے موسم وہ کہ پھاگن ہو کہ ماگھ
کس کو تھا معلوم شاخِ گل سے بھی برسے گی
آگ "بزمِ دشمن میں لگی ایسی مرے تلووں سے آگ
فرشِ گل کو میں نے سمجھا فرشِ اخگر زیرِ پا"

میری ہمت دیکھ کر رستہ بدلتے ہیں پہاڑ
میں چلوں گر آگے آگے پیچھے چلتے ہیں پہاڑ
برگِ لرزیدہ کی صورت ڈر سے ہلتے ہیں پہاڑ
"میں ہوں وہ آتش قدم جس سے پگھلتے ہیں پہاڑ
موم ہو جاتا ہے جو آتا ہے پتھر زیرِ پا"

مل گئی ہے صبحِ فرقت اس کے شامِ ناز سے
کب تلک تکتا رہوں اُس کو مقامِ ناز سے
چھوٹ نہیں سکتا پھنسا ہو جو بھی دامِ ناز سے
"دامنِ دل کیا بچے اس کے خرامِ ناز سے
چاک ہو آ جائے گر دامانِ محشر زیرِ پا"

کرتے آئے ہیں سدا برداشت تیری اُلٹی چال
اہلِ دنیا کب سے لیکن چھوڑ کر سب قیل وقال
دل کو اب برما رہے ہیں حبس اور قحط الرجال
"تیرے ہاتھوں سے ہوا ہے اِک زمانہ پائمال
پیش ڈالوں تجھ کو اے چرخِ ستم گر زیرِ پا"

آ بتاتا ہوں تجھے اک بات جو ہے راز کی
دیکھ عیاری یہ ہے سب ایک خانہ ساز کی
دل کی کھڑکی جس کی خاطر میں نے آخر باز کی
"آرزو کمبخت نے کی تھی خرامِ ناز کی
دے دیا اُس نے مجھے دل کو مسل کر زیرِ پا"

کچھ نہیں تاثیر باقی آہ، آہِ شوق میں
پڑ گیا ہے اب گہن یاں مہر و ماہِ شوق میں
ڈبکیاں کھاتا ہوں پیہم کب سے چاہِ شوق میں

تضمین

براشعار فصیح الملک مرزا نواب داغؔ دہلوی

گرفتہ دل ہیں کب سے، قصّہ سن اُمیدواروں کا
کبھی تو نے نہ پوچھا حال ان حسرت کے ماروں کا
رقم دل پر ہوا یہ حرف تیرے بے قراروں کا
”کرے انصاف دنیا میں اگر آفت کے ماروں کا
بنے خود آسماں پھایا تمہارے بے قراروں کا“
فغاں کرنا بھی ٹھہرا جرم اب آفت کے ماروں کا
ہوا روشن نہ یکسر حال تجھ پر بے سہاروں کا
کوئی تو قدر داں نکلا نہ تیرے خاکساروں کا
”ستم وہ چشم کافر سے ترے چلنا اشاروں کا
غضب وہ دل پکڑ کر بیٹھ جانا بے قراروں کا“
ہوئی ہے خیمہ زن جب سے تمہاری چاہتیں دل میں
سکوں غارت ہوا دم توڑتی ہیں راحتیں دل میں
دھواں سَر میں، نظر میں دھند اور ہیں وحشتیں دل میں

خواہشوں کے آئینے پر زور سے پتھر نہ پھینک
میری آنکھوں میں سمٹ آئے ہیں جو منظر نہ پھینک
حاصل بادہ کشی ہے سارا یہ دفتر نہ پھینک
"توڑ کر اے محتسب میخانے سے باہر نہ پھینک
آ نہ جاویں ریزۂ مینا و ساغر زیرِپا"

کس قدر ہے سارا عالم پرملال و پرحزیں
دل کہیں، آنکھیں کہیں ہیں سوچ کے محور کہیں
اس حقیقت پر نہیں آتا کسی کو بھی یقیں
"دونوں دشمن ہے بشر کے آسماں ہوں یا زمیں
فتنہ گرہائے سر ہے تو ستم گر زیرِپا"

جادۂ الفت میں ہیں موجود کتنے پیچ وخم
کام کچھ آتا نہیں اس رہ گزر میں خم وچم
سچ کہا ہے داغؔ صاحب نے فریدؔ اللہ قسم
'وہ صراطِ عشق پر اے داغؔ ہو ثابت قدم
مشق کی ہو جس نے رکھ کر تیغ و خنجر زیرِپا"



تضمین

بر اشعار اقبالؔ

موج وحباب کے لئے جوئے رواں ہے تو کہ میں
وہ جو نظر سے ہے نہاں اُس کا عیاں ہے کہ میں
تنگ ہے ذاتِ خاکیاں، تابہ کراں ہے تو کہ میں
"عالم آب وخاک باد! سرعیاں ہے تو کہ مَیں
وہ جو نظر ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں"
صبحِ ازل کہ آئے جب جنّ وملک کے قافلے
سجدۂ عبدیت سے پھر سب نے جبیں سجائے
شامِ ابد بھی دیکھ لی خلد سے ہم نکل گئے
"وہ شبِ درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تو کہ میں؟ اس کی اذاں ہے تو کہ میں"
مانا کہ عرشیوں کو تھا میری نمود ہی سے بَیر
بزمِ فکان کن میں ہے میرے جنوں سے اب نہ خیر
یاں کہ اُلجھ کے رہ گئی صبح حرم سے شامِ دیر

''خدا جانے ہوئی ہیں دفن کیا کیا حسرتیں دل میں
پھپھولوں سے مرے سینے پہ عالم ہے مزاروں کا''

نہ راس آئی تمہیں مہر و وفا الفت پرستوں کی
ستم اور جور ہی ٹھہرے سزا الفت پرستوں کی
نہ لائی رنگ کچھ صبر و رضا الفت پرستوں کی

''تمہیں چاہا اگر چاہا خطا الفت پرستوں کی
تمہیں دیکھا اگر دیکھا گنہ اُمیدواروں کا''

یہ رنگِ مجلسِ رنداں سراسر آنکھ سے دیکھے
بدستِ پیرِ میخانہ مکرّر آنکھ سے دیکھے
قرابا دومنی ، شیشہ یہ ساغر آنکھ سے دیکھے

''قسم ہے تجھ کو زاہد کیا کرے گر آنکھ سے دیکھے
چھلکنا ساغرِ مے کا چمکنا بادہ خواروں کا''



فرید نامہ

''کس کی نمود کے لئے شام وسحر ہیں گرمِ سیر
شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ مَیں''

منشہ ٔحق کی روبرو ڈال دیئے ہیں اب سپر
ابر گریز پا سے کب میں نے کہا کہ ہاں ٹھہر
نخلِ اُمید کے لئے مانگے نہیں کبھی ثمر

''تو کفِ پا و بے بصر! میں کفِ خاک وخودنگر
کشتِ وجود کے لئے آب رواں ہے تو کہ میں''



از رُباعی بیت آخرمی زندناخن بہ دل
خط پشت لب بہ چشم مازابروخوش تراست

صائب تبریزی

''وچوں بریں دو وزن (مفعول، مفاعلن دوبار) اخرب و اخرم سالم عروض وضرب کی پیش ازیں ایراد افتاد بسبب زیادت کنند، وزن دوبیتی شود کہ یکے از متقدمان شعرائے عجم است از وزنِ اخرب واخرم ایں بحرتخریج کردہ است والحق وزنے خوش ومقبول است وشعرے متلذ مطبوع است''

المعجم فی معائراشعارالعجم
شمس الدین محمد بن قیس رازیؔ

''رباعی کسی شخصی ایجاد کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ ارتقاء یافتہ شکل ہے۔قدیم چہار بیتی کی جو ہزج مربع اخرم و اخرب میں لکھی جاتی تھی۔ان ایام میں صدروابتداء میں اخرب ومکفوف،اخرب وموفور کا اختلاف جائز سمجھا جاتا تھا جو چاربیتی کے ہر مصرعے میں کارفرما ہے''

تنقید شعرالعجم
پروفیسر محمود شیرانیؔ

انتساب

آبروئے قلم ڈاکٹر علی احمد جلیلیؔ صاحب
ابنِ فصاحت جنگ جلیلؔ مانک پوری
اور
علامہ اخلاق حسین دہلوی (مرحوم)
کے نام

● -رات کے اندھیروں میں الاؤ کی طرح روشن اور برف سے ڈھکے ہوئے پربتوں پر 'لفظ چراغ'، جب روشن نظر آتے ہیں تو روح میں ایک سرشاری کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ مجھے پربتوں پر روشن قندیل فریدؔ پربتی کے یہاں نظر آئی۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوا جیسے شبد، چنار کے درختوں میں خیال کے سرخ سرخ پتے جھوم رہے ہیں اور ڈل جھیل میں سوچ کا خوبصورت عکس نظر آرہا ہے۔ لفظوں کے سینوں میں معانی کی کانگڑی چمٹی ہوئی ہے۔ لفظ اور کاغذ بھیگتے نہیں بلکہ پانیوں میں اور بھی روشن ہوجاتے ہیں۔ شبدوں کے جب جھرنے بہتے ہیں تو نغمگی اور موسیقیت کا پرسرور احساس پورے وجود میں دوڑنے لگتا ہے۔ اس وقت ایسا لگتا ہے جیسے شبد کے جھرنے میں معنی تیر رہے ہوں۔

فریدؔ پربتی اپنے شعری طریق اور تخلیقی اظہار میں وحید و فرید ہیں۔ انہیں شعری روایات کی جمالیات کی آگہی ہے اور انسانی اقدار و روایات کا عرفان بھی ہے۔ درد و غم ان کے تخلیق وجدان کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں وہ ساری آوازیں مل جاتی ہیں جو کسی ٹوٹے ہوئے زخمی دل سے آہ کی صورت ابھرتی ہیں۔ ''اثبات'' گوکہ رباعی کا مجموعہ ہے مگر اس میں فکر کا ایک دریا موجزن ہے۔ اثبات کے یہ وہ شاعر ہیں جنہوں نے ہماری دھڑکنوں کو ان دھڑکنوں سے ملا دیا جو نفی کی نذر ہوگئیں۔ نفی و اثبات کے مقامات طے کرنے والے اس شاعر نے ہمیں اس ''سرمد'' سے بھی ملایا جو ایک صادق کردار ہے، ہمیشہ زندہ رہنے والا۔ سرمدؔ کے مزار پر جا کر جو کچھ عرفان حاصل ہوتا ہے، ان کی تخلیقی وجدان کا حصہ بن جاتا ہے اور ان عرفان کی کرنیں ان کے شعروں میں جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ سرمدؔ نفی میں مستغرق تھے۔ 'اثبات' کی منزل تک نہیں پہنچے تھے، انہوں نے لا الہ کی منزل سے آگے کی منزل طے نہیں کی تھی۔ الا اللہ ان کی نظر میں تمنا کا دوسرا قدم ہے۔ انہوں نے شبد اور ارتھ کے گہرے ارتباط کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے شبدوں کے درمیان بھی انہوں نے منزلوں کے فاصلے کو محسوس کیا تھا۔ لفظوں کی معنویت اور حرمت کا سب سے بڑا استعارہ سرمدؔ کا وہ قول تھا کہ میں ابھی لا الہ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ''سرمدؔ کے مزار پر'' فریدؔ پربتی کی بہت ہی پر اثر تخلیق ہے۔ اس میں شاعر نہیں بلکہ ایک صوفی کا دل دھڑک رہا ہے۔

''ایں بناء را شخص معینی نگذاشتہ بلکہ ایں نوع شعر از مدت ہا قبل در ایران شائع و رائج بودہ از ہمیں حکایات چنیں برمیآید کہ ایں وزن اختراع نشدہ بلکہ از بودہ مردم فارسی زبان اقتباس کردیدہ و ہمہ جا تفریح ہست بانیکہ در عربی چنیں وزنے بنودہ و بعد عرب ہا آں را از ایرانیاں آموختہ اند''۔

چگونگی تحول اوزان غزل
پروفیسر پرویزناتل خانلری

چناں نام من روشناس است در ہند
کہ نقشِ نگیں درمیان سیاہی

غنی کاشمیری

فریدؔ پربتی کے تخلیقی اظہار اور سوچ کے رنگ بہت منفرد ہیں۔انہوں نے رباعیوں کے علاوہ غزلیں بھی کہیں ہیں اور بہت ہی خوش رنگ غزلوں میں شیرینی ،موسیقیت نغمگی ہے اور آتشِ چنار کی طرح غزل کی للیما سرخ ہے۔

فریدؔ پربتی کے اشعار صوفیانہ سوچ کے مظہر ہیں۔فنانی الشعر فریدؔ فنانی العشق کے مقامات کی سیر کراتے ہیں۔ان کا ذہن غیر مشروط ہے۔اس لئے ان کا فکری تناظر بھی وسیع ہے۔انہوں نے اثبات کے ذریعے عشق وعرفاں کی بہت سی منزلوں اور مقامات کو طے کیا ہے۔فریدؔ پربتی کی شاعری میں اثبات کا جو فکری اور جمالیاتی تناظر سامنے آیا ہے، وہ عام شاعروں سے مختلف ہے۔ اس اثبات میں نفی کی وہ منزل بھی روشن ہے جو انکشافِ ذات کا وسیلہ بنتی ہے۔یہی وہ مرحلہ ہے جس کو طے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔اس غروب میں طلوع بھی مضمر ہے اور اسی طلوع میں غروب بھی۔یہ احساس فریدؔ پربتی کو بھی ہے کہ فنا میں بقا ہے اور بقا میں فنائیت۔انہیں کا شعر ہے

وجود بکھر چکا ہے، جنوں کے در سے خرد کے گھر تک
قدم قدم پر ہوں دفن میں ہی جگہ جگہ ہے مزار جاناں

یہ صرف انکشافِ ذات کا شعر نہیں ہے بلکہ پوری کائناتی وحدت کو ایک انسان کی ذات میں سمو دینے والا شعر ہے اور کائنات کی تفہیم ،ذات کی تفہیم پر ہی منحصر ہے۔اقبالؒ نے جو شعر کہا تھا ع

جہاں میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

وہ انہوں نے اسی تناظر میں کہا تھا اور فریدؔ پربتی نے بھی اسی احساس کو اپنے تخلیقی وجدان کا ایک حصہ بنایا ہے۔فنائیت اور اثبات کے اسی تخلیقی سفر میں ہمارے شعراء ابھی بھی نفی کی منزل میں کھوئے ہوئے ہیں۔اثبات کے مقام تک پہنچنے میں، پھر بھی جانے کیوں زعم کے شکار ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ہی جست میں انہوں نے ساری منزلیں طے کرلی ہیں۔ابھی اثبات کی منزل بہت دور ہے۔پہلے نفی کے مقام سے گزر کر تو دیکھیں.....فریدؔ پربتی کو اثبات کی منزل کا پتہ ہے۔ اسلئے انہوں نے 'اثبات' کے ذریعے دراصل اپنی نفی کا ایک تخلیقی شعری پس منظر پیش کیا ہے۔

❑❄❄❑

حقانی القاسمی

نعت

ایمان سے پر نور محمدؐ نے کیا
ہاں بیت المعمور محمدؐ نے کیا

دنیا سے مٹا شرک کہ تھا حرفِ غلط
توحید کو مشہور محمدؐ نے کیا



حمد

یکتا بھی یگانہ بھی مشہود ومآل
یکتائی مین تحلیل ہوا عزو جلال

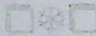
حیران تفکر ہے تحمل نگراں
دریا میں ہوا غرق مرا جامِ سفال



جیتا ہوں، کہاں تک میں جیتا ہی مروں
قدرت کا تری کیوں میں دم نہ بھروں

لے جاؤں میں کس کے پاس اپنا دُکھڑا
اُمید تجھی سے ہے جو فریاد کروں





دُعا

بے زور ہوں کچھ زور عطا کر مجھ کو
بے طور ہوں کچھ طور عطا کر مجھ کو

جنگل ہوں عطا کر دے مجھے شادابی
برسات ہوں اک مور عطا کر مجھ کو



رومیؔ ہوں نہ رازیؔ ہوں نہ خیامؔ و سعیدؔ
ہوں ذرۂ ناچیز کہ ہے نام فریدؔ

قدرت سے تری اٹھتا ہے صحرا میں حباب
ذرّوں سے اُگا دیتا ہے لاکھوں خورشید



شہر آشوب



برباد ہوا صحنِ چمن، رقص میں ہوں
ویرانہ بَنا اپنا وطن، رقص میں ہوں
باقی نہیں ارتباط روح اور تن میں
رہ بر ہے بشکلِ راہ زن، رقص میں ہوں



شیرازہ محبت کا پریشان ہوا
غارت عیش وسکوں کا سامان ہوا
اُس دور میں جیتا ہوں کہ جس میں انساں
خونخوار درندہ ہوا حیوان ہوا

فہمیدہ ہے تو شان فہیمی دِکھلا
رحمٰن ہے تو شانِ رحیمی دِکھلا
اپنوں اور غیروں کا ستایا ہوں میں
بس ایک نظر! شانِ کریمی دِکھلا

روشن کبھی ہو جائیں گے دن رات مرے
بس ایک وہی جانے ہے جذبات مرے
مجھ کو تو فقط اُس کے کرم پر ہے نظر
ہیں مدنظر اُس کو حالات مرے



ا۔ حکیم عمر خیام

ابتدائیہ

واقف میں ہر اِک خواب کی تعبیر سے ہوں
میں حسن ہوں اور حسن کی جاگیر سے ہوں

کہتے ہیں مجھے یوسفِ ثانی اے دوست
کنعاں سے نہیں، وادیٔ کشمیر سے ہوں





بڑھتا ہے اب احساسِ زیاں روز بروز
جلتا ہے اِک آسودہ مکاں روز بروز
بدلا ہے چمن، بدلا ہے گلچیں کا مزاج
خوابوں کا یاں اُڑتا ہے دھواں روز بروز



آنکھوں میں ہے دم اور نہ بازو میں زور
جینے کا سلیقہ ہے نہ مرنے کا طور
ہر شخص ہے بیزار یہاں آپ اپنے سے
کیا یہ زمانہ ہے یہ ہے کون سا دور



دلِ غم سے ہے بھرپور نگاہوں میں تھکن
کم کم ہی مزا دیتی ہے اب سیر چمن
اے صبح وطن پوچھ نہ تو وجہِ ملال
"ویں حرفِ معمہ نہ تو خوانی و نہ من[1]"



خاشاکِ وجود ایک بھنور میں رہتا
اے بے خبری اپنی خبر میں رہتا
سانسوں نے نہیں چھوڑی وظیفہ خوانی
مصروف میں کیا کارِ دگر میں رہتا

پھولوں سے چرا کر وہ مہک بھیجتا ہے
آکاش کی خوش رنگ دھنک بھیجتا ہے
خالی نہیں رہ سکتا ہوں وہ جانتا ہے
زخموں کے لئے تازہ نمک بھیجتا ہے





بازار کے معیار کو اب تول ذرا
خاموش ہے کیوں بول ذرا بول ذرا
تازہ ہیں مضامین نئی طرزِ ادا
اے فکر رسا بندِ قبا کھول ذرا





بے کیف شب و روز کو اچھا کر دے
ارمان مرا اب کے یہ پورا کر دے
ہیں موت کے سامان یہاں چاروں طرف
اب زیست کے سامان مہیا کر دے

تلخابۂ دنیا بھی مزا دیتا ہے
جینے کے لئے طرزِ ادا دیتا ہے
صحرائے لق و دق میں بٹھانے والا
زمزم سے مری پیاس بجھا دیتا ہے





تحلیل کے امکان سے ڈر جاتا ہوں
بے سمت منازل سے گزر جاتا ہوں
باندھی یہ ہوا پیٹھ پہ میری کس نے
رُکتا ہوں کہیں پرؔ نہ ٹھہر جاتا ہوں

دُنیا کو نیا طور سکھانا چاہوں
چاہت کسے کہتے ہیں‘ بتانا چاہوں
خواہش ہے کروں عشق میں‘ اور ایسا عشق
جس عشق میں ہر شئے کو بھلانا چاہوں





کندن سا کٹھالی میں پگھل جاتا ہوں
چھو جائے صبا رنگ بدل جاتا ہوں
دہکایا ہے آشوب زمانہ نے جسے
ہر وقت اسی آگ میں جل جاتا ہوں



یاں دائم و قائم نہ ہے رشتہ کوئی
اس بات کو کب یہاں پہ سمجھا کوئی
میں دیکھ چکا، پَرکھ چکا، سوچ چکا
اپنے ہیں سبھی پر، نہیں اپنا کوئی





اس درجہ خراب ہوگیا، میں آخر
آپ اپنا جواب ہوگیا، میں آخر
منظر ہوں مگر پیاس کا منظر ہوں فریدؔ
پانی تھا سراب ہوگیا، میں آخر



میں ذرۂ ناچیز ہوں، صحرا نہ سہی
میں قطرۂ بے فیض ہوں، دریا نہ سہی
پانی میں ہر اِک گھاٹ کا پی کرآیا
دنیا ہوں مگر فیض کی دنیا نہ سہی





تاریک ہیں دن مہر درخشاں آجا
کنعاں کی طرف یوسفِ زنداں آجا
یعقوبؑ کی بے نورِ نگاہوں کی قسم
کٹتی ہی نہیں شامِ غریباں آجا



سرمایۂ اخلاص گنواتے ہیں لوگ
سوئے ہوئے فتنوں کو جگاتے ہیں لوگ
یہ بادِ صبا کو کہتے ہیں بادِ سموم
پھولوں کو یہاں آگ پلاتے ہیں لوگ





نکلا تھا تجھے ڈھونڈنے ہر شہر و دیار
بے تاب نظر، چاک جگر، سینہ فگار
اِس دشت نوردی کا یہ حاصل ہے فریدؔ
چہرے پہ جمی گرد بدن پر ہے غبار



کتنے ہی دنوں دُور رہا، پاس تو آ
کب تک رہے گا یونہی جدا، پاس تو آ
اِک سانس نہ لے سکتا ہوں میں تیرے بغیر
میں والہ وشیدا ہوں ترا، پاس تو آ





جینے کا عجب نقطہ بتایا مجھ کو
اِک دائرۂ بقا میں لایا مجھ کو
پیاسا ہی سکندر بھی جہاں سے لوٹا
ظلمات کا وہ شہر' دکھایا مجھ کو



کر فصلِ تلطّف سے ہم آغوش مجھے
بے پیٔے مئے وصل سے' مدہوش مجھے
میں تجھ سے ہی قائم بھی ہوں اور دائم بھی
کس بات پہ کرتا ہے فراموش مجھے





چاہت میں حدیں ساری مٹاتا جاؤں
دل چیز ہے کیا، جاں میں بساتا جاؤں
اُس حسنِ خداداد کو تکنے کے لئے
ہر عضوِ بدن آنکھ بناتا جاؤں



لپٹا ہے گلے مجھ سے ڈسنے کی طرح
وہ آن بسا مجھ میں بسنے کی طرح
اِک نقطۂ موہوم بنا جاتا ہوں
دیکھو دیکھو کوئی یہ کسنے کی طرح





کھول اب سبھی پیچاک، نہ من بھاری کر
اے گردشِ افلاک، نہ من بھاری کر
اُمید کے کوزے میں کج پڑنے لگا
اُلٹا نہ گھما چاک، نہ من بھاری کر



اتمام توقع ہے فقط خود کامی
رشتوں کی ہے نوعیت یاں ہنگامی
بیٹھے ہیں تعدّی پہ کمر باندھ کے سب
نے دوست زمانہ ہے، نہ دنیا حامی





پھر شمع صفت ہجر میں گھل جاتا ہوں
اور اپنی حدوں سے بھی نکل جاتا ہوں
اِک بھیگتا موسم ہے تیری یادوں کا
جگنو کی طرح بجھتا، نہ جل جاتا ہوں



بڑھ جائے گا اضطراب، پھر کیا ہوگا
دل کھائے گا پیچ وتاب ،پھر کیا ہوگا
اُن بانہوں میں دم بھر کو سکوں لے جاؤں
گر ٹوٹ گیا یہ خواب، پھر کیا ہوگا





گم اَبر میں ہے ماہِ مبیں کیوں میرا
دل قرب پہ آمادہ نہیں، کیوں میرا
شاید کہ مری زیست کے دن اب ہیں قلیل
اُٹھنے یہ لگا تجھ پہ یقیں، کیوں میرا



ہر خواب کی تعبیر کو دیکھا ہی کیا
آئینوں نے حیرت کا تقاضا ہی کیا
دنیا سے ہوں نفرت کہ محبت تجھ سے
جو کام کیا میں نے ادھورا ہی کیا





دل ہوگا اُچاٹ اُچاٹ اِس چَچ گچ پر
ہرار ذل واَسفل کہ ہے اس کی چچ پر
دنیا کے غلط کو نہ کبھی کہنا غلط
ایراد کرے گی یہ' تمہاری سچ پر



اطراف میں خوشبو سی کھلی لگتی ہے
سانچے میں نئی طرح ڈھلی لگتی ہے
آنا وہ ترا ہوکہ چلے جانا ترا
ہر ایک ادا تیری بھلی لگتی ہے





اب تک نہ کیا وہ بھی میں کرسکتا ہوں
ہر آگ کے دریا سے گزر سکتا ہوں
نفرت دنیا سے اور محبت تجھ سے
اِک وقت میں دو کام بھی کرسکتا ہوں



جذبات کی دنیا ہوں، برنائی ہوں
آپ اپنی اداؤں کا تماشائی ہوں
آ! حسن کی دنیا، کر اَب میری طواف
بھر پور جوانی ہوں ، رعنائی ہوں





اِک شائبۂ رنج وتعب اور بھی ہے
اس وقت دل وجاں کی طلب اور بھی ہے
دُنیا کا بکھیڑا ہی نہیں جانِ من
تجھ کو تو بھلانے کا سبب، اور بھی ہے



اظہار کی لذت ہے ہم آغوش رہوں
صد شکر کروں یا کہ سبک دوش رہوں
ہر لفظ بنا بتائے سننے والے
کچھ عرض گزاروں کہ میں خاموش رہوں





بے چہرہ کئے دیتی ہے کثرت اپنی
خانوں میں بٹی رہتی ہے وحدت اپنی
سیماب کا قطرہ ہوں کہ ہوں آبِ رواں
یکساں نہیں رہتی ہے طبیعت اپنی



یہ چاند یہ تاروں کی ردا، کس کے لئے !
غنچوں کے لبوں پر ہے دُعا کس کے لئے !
گر میرے لئے نہیں ہے پھر تو ہی بتا
یہ پھول ، یہ شبنم، یہ صبا کس کے لئے !





ہر ایک عمل ، ردّعمل رکھتا ہے
ہر اچھا بُرا اپنا بدل رکھتا ہے
بیٹھا ہوں اسی پیڑ کے سائے کے تلے
جو پھول نہ پتّہ نہ پھل رکھتا ہے

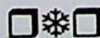
ڈوبا بھی نہ تنکے کا سہارا مانگا
اِک بار نہ ہی میں نے دوبارا مانگا
اے قرب کے بے اَنت سمندر میں نے
اب تک نہ کبھی تجھ سے کنارا مانگا





جُل جُل کے بُجھایا مرا جگنو اکثر
چلتا ہے مجھی پر ترا جادو اکثر
اس درجہ تصوّر ہے ترا شور انگیز
مَیں مَیں نہ رہا رہا فقط تو اکثر

ہر عہد مشیت کو نبھایا میں نے
امکان کو ممکن میں دکھایا' میں نے
کی کوہ وبیاباں پہ گرانی جس نے
وہ بوجھ اُٹھایا تو اُٹھایا' میں نے





اِک شخص کو گر گر کے سنبھلتے دیکھا
ہر طرزِ کشاکش کو بدلتے دیکھا
دنیا تھی کہ عقبی تھا، کیا شے تھی بلا
قدموں سے کسی شے کو مسلتے دیکھا



ہر لحظ تھا مدہوش، مگر آج یہ دن
ہر نیش میں تھا نوش، مگر آج یہ دن
یہ بات ہے کل کی کہ زمانہ تھا دوست
تھا تو بھی ہم آغوش، مگر آج یہ دن





سرتا بہ قدم جوڑ گئے، پھول ہی پھول
ہر شاخ سے وہ توڑ گئے' پھول ہی پھول
نازک سا بدن، ہونٹ گلابی اُس کے
تا حد نظر چھوڑ گئے ، پھول ہی پھول

قسام ازل نے کیا پُرخود ہی ایاغ
میں نے نہ دکھایا تھا کبھی جی کا داغ
گھر کہنے لگا یاں سے دلدّر بھاگا
فانوسِ خوشی میں بھی جلایا ہے چراغ





باہم روشِ گل پہ چلیں گے شاید
اِک شاخ پہ پھر ہم نہ کھلیں گے شاید
وعدے کے ہنڈولے میں بٹھانے والے
اس راہ میں پھر ہم نہ ملیں گے شاید



یک لخت بدل جائے گا، پیکر میرا
یوں سانچے میں ڈھل جائے گا، پیکر میرا
معلوم نہ تھا لمس بدن سے مجھ کو
اس درجہ پگھل جائے گا، پیکر میرا





کب تک میں یونہی بُنتا رہوں خواب و خیال
حاصل ہیں فقط رقص جنوں خواب وخیال
پگھلا دیا تِل تِل تری دوری نے مجھے
عنقا ہوا آرام، سکوں خواب وخیال



کرنا جو نہ تھا، وہی کیا پانی پر
بے وجہ کیا فتنہ بپا پانی پر
بدلا نہ ابھی تک مرے گاؤں کا مزاج
پھر آج یہاں قتل ہوا پانی پر





خاموش سمندر میں اُبال آیا پھر
یا باز پسیں لہریں سنبھال آیا پھر
اِک درد سا کنمناتا ہے دل میں مرے
شاید کہ مجھے ترا خیال آیا پھر



امکان بھرا حربہ بھی ضائع ہوگا
ہو دشمن جانی وہی نافع ہوگا
کل چھاؤں جہاں پر تھی، وہیں ہوگی دھوپ
ہاں آج نہ کل اوج پہ طالع ہوگا





دیکھے گا اسے جو بھی چرا لے گا اِسے
قبضے سے کسی طرح نکالے گا اِسے
یادوں کا اِک گنجِ رواں ہاتھ آیا
اب میرے سوا کون سنبھالے گا اِسے



قائم رکھیں آسودہ مکاں، ہم دونوں
اِک دوجے پر ہوں مہرباں، ہم دونوں
چلتا رہے ہمراہ شراب اور کباب
اے کاش رہیں یونہی جواں، ہم دونوں





سینے پہ لئے سنگِ گراں، ہوں میں بھی
اور اس کی طلب میں خوں فشاں، ہوں میں بھی
رنگوں کے تعاقب میں وہ ہے سرگرداں
خوابوں کی بس اِک دُھن میں رواں، ہوں میں بھی



ٹھہرے ہوئے لمحوں کا شمار، آیا ہاتھ
بکھرا ہوا اِک قول و قرار ، آیا ہاتھ
جس راہ کی میں نے عمر بھر چھانی خاک
اس راہ کا فقط ایک غبار ' آیا ہاتھ





سامانِ تب و تاب کا سودا نکلا
اندوختہ اچھوں کا اچھا نکلا
یادیں بھی تمنائیں بھی ہیں دل میں مرے
کوزے میں سمایا ہوا دریا نکلا



تنہا ہوں ، نہیں میرا سہارا کوئی
باقی نہ فلک پر ہے ستارا کوئی
جس چاند کی خاطر یہ اماوس کاٹی
اس چاند کو لے ڈوبا نظارا کوئی





ضدین میں جمعیت و تطبیق ہوئی
اور چھان پھٹک کے ذرا تصدیق ہوئی
سمجھا جب اُٹھالے گا امانت کا بار
پھر حضرتِ آدمؑ کی تخلیق ہوئی



اخلاص کا اِک مرکز و محور ہے قریب
بے سمت وجہت رہ کا شناور ہے قریب
میں نے جو کہا عشق کا معنی کیا ہے
اُس نے یہ کہا، دیکھ سمندر ہے قریب





ہے چاند کے ہاتھوں میں پھریرا، لیکن
آنکھوں میں ہے رنگوں کا بسیرا، لیکن
ہر چیز میسر ہے بفضلِ مولیٰ
اِک ساتھ میسر نہیں تیرا، لیکن



تاریکی میں مصلوب رہا ہے سورج
طالب کبھی مطلوب رہا ہے سورج
بڑھنے لگے اس درجہ پرائے سائے
مٹکے میں یہاں ڈوب رہا ہے سورج





خود ساختہ اِک شمع کا پروانہ ہوں
جس کو نہ سنے کوئی وہ افسانہ ہوں
ہوں وقت کی میں بھیڑ میں کھویا کردار
آپ اپنا طلب گار ہوں ، دیوانہ ہوں



پیدا سے پنہاں میں اُترنا چاہوں
موّاجِ تسلسل میں بکھرنا چاہوں
تازیست مجھے خود سے الگ کر کے گیا
پھر اُس سے ملوں، خود سے گزرنا چاہوں





پرُلطف مقاموں کا تماشا ہوتا
ہر دن مرا اچھے سے اچھا ہوتا
اس درجہ نہ ہوتا مرا جینا دوبھر
اے کاش تجھے اتنا نہ چاہا ہوتا



یہ مرکز اصلی ہے اس کی شہ پر
ناسفتہ خیالات ہیں جس کی شہ پر
یہ کون مری پیٹھ کو تھپکاتا ہے
شہہ زور سے لڑتا ہوں، کس کی شہ پر





اِک درد کا سرمایہ بہم کرتا جا
ارمانوں کے سر کو قلم کرتا جا
صابر ہوں ، بجز صبر مرے پاس ہے کیا
حاضر ہوں ، تواتر سے ستم کرتا جا



برگشتہ فضا، تنگ یہ حالات سہی
اس دور میں جی لینا کرامات سہی
آندھی ہے، اندھیرا ہے، قریں کام نہنگ
جینا ہے مگر! تلخ یہ اوقات سہی





گرتی ہوئی دیوار، نہیں کچھ بھی نہیں
چلتی ہوئی تلوار، نہیں کچھ بھی نہیں
سینے میں عجب شور بپا ہے کل سے
ہے یادِ گراں بار، نہیں کچھ بھی نہیں



سینے میں نہ وہ جوش نہ آتش ساقی
باقی ہے فقط یادِ پری وش ساقی
رخصت ہوا سب ہوش و خرد، تاب وتواں
اِک دم ہے ، وہ ہے صرفِ کشاکش باقی





آپ اپنے کو وابستۂ حیرت کر کے
مر مر کے جئے جاتا ہوں جرأت کر کے
شاید کہ یونہی زیست کا سوتا پھوٹے
ہر زہر کو پی لیتا ہوں اُمرت کر کے



احساس کی دنیا میں سجا لے مجھ کو
کیا جانئے کس رہ سے نکالے مجھ کو
بن جاؤں صبا میں کہ بنوں بادِ سموم
اب اُس نے کیا میرے حوالے مجھ کو





پھر لقمۂ سیلاب ہوا جاتا ہوں
میں خواب ہوں اور خواب ہوا جاتا ہوں
جس میں ہے کنارا نہ ہی ساحل کوئی
اس بحر میں غرقاب ہوا جاتا ہوں

سانچے میں نئے وقت کی ڈھل جاتی ہے
چلتے چلتے رستہ بدل جاتی ہے
بچپن ہو، لڑکپن ہو، جوانی ہو کہ زیست
ہاتھوں سے ہر اِک چیز نکل جاتی ہے





سکھلا کے خوئے نرم و آداب یہاں
دکھلاتا ہے کیوں خوابِ ضیاءِ تاب یہاں
ہم خاک نہادوں کو بنانے والا
کیوں بھیجتا ہے تندیٔ سیلاب یہاں



خواب اور حقیقت کا سماں دیکھا کر
اِک گنبدِ بے در کا نشاں دیکھا کر
تو رنگ ہے اور میں ہوا کا جھونکا
بے نفع ہوں، یہ کارِ زیاں دیکھا کر





اندیشوں میں ہر وہم گماں ڈولتا ہے
مجھ پر بھی کبھی مجھ کو نہیں کھولتا ہے
بے قصد نہیں چھوڑتا ہے سانس مری
شہ رگ پہ مری بیٹھ کے وہ بھولتا ہے



مہتاب کا سینہ بھی ہے داغوں سے چراغ
توقیر سے عاری ہے، سراغوں سے چراغ
مانگے کے اُجالوں پہ ہے دنیا قائم
جلتا ہے یہاں فقط چراغوں سے چراغ





اجمال کا طالب ہوا تفسیر میں گم
کیسا یہ تصوّر ہے، ہوں تصویر میں گم
جو خواب ابھی تک نہیں دیکھا میں نے
اب تک ہوں اُسی خواب کی تعبیر میں گم



ہر سایہ بغل گیر نہیں ہوسکتا
یا پاؤں کی زنجیر نہیں ہوسکتا
میرا وہ نہیں ہوتا مرا ہوکر بھی
گھر ریت پہ تعمیر نہیں ہوسکتا





اس جہد مسلسل کا یہ حاصل بھی ہے
اے ڈوبنے والے یہی ساحل بھی ہے
ہر آپ کو "میں" کر کے دِکھانا چاہتا ہوں
آسان ہے یہ کام، پہ مشکل بھی ہے



لمحاتِ گریزاں کو سمٹ کر دیکھا
اور عصر رواں سے بھی کٹ کر دیکھا
یادوں کی اذیت ہی فقط ہاتھ آئی
ماضی کی طرح جب بھی پلٹ کر دیکھا





خوابوں کی رقابت ہے کہاں تک جاؤں
اب کیسے بھلا اپنے مکاں تک جاؤں
اپنے ہی تعاقب میں ہوں سرگرداں
اس گنبد بے در میں، جہاں تک جاؤں



کم کوش، سبک بار کہے جاتے ہیں
ہیں کُند پہ تلوار کہے جاتے ہیں
دیں رائے حدیں پھاند لیں، یہ ٹھیک نہیں
مجبور ہیں، مختار کہے جاتے ہیں





خانوں میں کئی خود کو میں بٹ کر آیا
اے حبِ وطن تجھ سے بھی کٹ کر آیا
اب اپنے وطن میں بھی نہیں جی لگتا
یہ کیسے سفر سے میں 'پلٹ کر آیا



دونوں کے ملن کا کوئی ساماں بھی نہیں
اور رُت کے بدل جانے کا اِمکاں بھی نہیں
بے طرح گیا کر کے ادھورا مجھ کو
اس بات پہ لیکن، وہ پشیماں بھی نہیں





بے چہرہ مسبب سبب تیرے بغیر
بے کیف ہر اک بزم طرب تیرے بغیر
آ حسن کی دنیا کر امداد مری
مصرف نہیں کچھ زیست کا، اب تیرے بغیر



دُنیا پہ یقیں کر کے بڑی چوک ہوئی
ہر ایک حقیقت یہاں مشکوک ہوئی
اخلاص کے بارے میں سنا تھا پہلے
اس دور میں یہ چیز بھی متروک ہوئی





کب چاند ستاروں سے رفق لیتا ہوں
کب چرخ کی خوش رنگ شفق لیتا ہوں
جلتا ہے وجود جس سے جگنو کی طرح
میں ایسے اُجالوں سے سبق لیتا ہوں



رہتے ہیں ہم اک دوسرے سے دور ہی دور
بے حال ہوں میں اور ہے تو بھی رنجور
ماضی کا وہ ہے عکس کہ آئینۂ حال
ملنے سے کوئی دونوں کو، مانع ہے ضرور





ممنونِ کرم کیا نہایت مجھ کو
سکھلائی عجب طرزِ کفایت مجھ کو
دُنیا سے نہیں مجھ کو شکایت کوئی
آپ اپنے سے ہے فقط، شکایت مجھ کو



جب آنکھ اُٹھی اُس کی، جوانی کی طرف
مائل ہوا دل، قصّہ کہانی کی طرف
شفاف بدن، جھیل سی گہری آنکھیں
لو ہاتھ بڑھایا میں نے، پانی کی طرف





ہر سمت سے ہوں میں ہی ہدف، یا مولیٰ
ہے سنگ زنی چاروں طرف، یا مولیٰ
ہے کون مددگار مرا تیرے سوا
ہر شخص ہے شمشیر بکف، یا مولیٰ



ناپید ہے ہر وہم وگماں، اپنے سوا
ملتا ہی نہیں کوئی نشاں، اپنے سوا
اِک گنبد بے در میں مقیّد ہوں میں
آواز کسے دوں میں یہاں، اپنے سوا





خوش فہم ہوں خود سے بھی اُڑا ہوتا ہوں
اس زعم میں اکثر میں بڑا ہوتا ہوں
قد تجھ سے ملانے کا ہے چرایا شوق
پنجوں پہ اسی لئے کھڑا ہوتا ہوں



میں جسم ہوں اور میری جاں، ترے ہات
میں تیر ہوں اور میری کماں، تیرے ہات
اے عشق کی نوخیز ہوا لے چل ساتھ
کشتی ہوں ہے میرا بادباں تیرے ہات





گہرائی بھی مجھ میں ہے، گیرائی بھی
محفل بھی ہوں، رونق بھی، تنہائی بھی
میں، میں نہیں رہتا جو دوجا ہوتا
میں خود ہی تماشا ہوں، تماشائی بھی



ہوں مملکت مصر سے محروم ابھی
پتھر کے تلے ہے مرا مقسوم ابھی
یوسفؑ کی طرح اندھے کنویں میں ہوں پڑا
ہر خواب کی تعبیر ہے، موہوم ابھی





کیوں ریت پہ مانند ہوا پھرتا ہے
اُٹھتا ہے کبھی اور کبھی گرتا ہے
دامن نہ بگولے کی طرح بھر اپنا
خشکی پہ کبھی کوئی کہاں ترتا ہے!



ہر مسئلے کی تہہ میں اُترنا، نہیں ٹھیک
اس زندگی کے ہاتھوں سے مرنا، نہیں ٹھیک
دُنیا میں بہت کر کے یہ دیکھا میں نے
اس دُنیا میں کچھ بھی کرنا، نہیں ٹھیک





میں کھیت نہ کھلیان پہ مرنے کا نہیں
ہاں بارِ دگریاں سے گزرنے کا نہیں
میں اَبر ہوں آؤں گا چلا جاؤں گا
رُکنے کا نہیں ہوں میں ٹھہرنے کا نہیں



سامانِ صبر وتاب بن کر آجا
جی لوں میں تاب و آب بن کر آجا
جگمگ ہوں مری زیست کے دن رات جسے
ظلمت میں وہ آفتاب، بن کر آجا





پھر بوجھ اُٹھانے کو سنبھلنے کے لئے
ہاں رنگِ دگر گونہ میں، ڈھلنے کے لئے
اندوہ نصیبوں کو خوشی کے لمحات
ملتے ہیں مزا منہ کا، بدلنے کے لئے



اے تیز قدم، راہ بدلنے والے
سانچے میں نئے روز ہی ڈھلنے والے
للہ بس اِک بار پلٹ کر آجا
اے رہ گزر باد پہ، چلنے والے





حالات سے سمجھوتہ کرایا اُس نے
جو گھر بھی ملا اس کو، وہ ڈھایا اُس نے
تعمیر کے پہلو میں! یہ تخریب کا کام؟
پھونکوں سے دِیا دل کا، بجھایا اُس نے



پرہول مناظر سے، گزرنا بھی پڑا
نادیدہ مقاموں پہ، ٹھہرنا بھی پڑا
اے روشنیٔ جاں، تجھے پانے کے لئے
جینا بھی پڑا ہے، مجھے مرنا بھی پڑا





ٹوٹی ہوئی دیوار نظر آتی ہے
سائے سے یہ بیزار نظر آتی ہے
اے زیست کے سائے میں اُچھلنے والو
کاندھوں پہ مجھے بار نظر آتی ہے



بے وجہ کبھی اپنے مقابل اُڑنا
شاید کہ اسے کہتے ہیں، حد سے بڑھنا
اس کشمکش ذات کے گرداب کے بیچ
سیکھا ہے کہاں سے یہ ہوا سے لڑنا





ہے شوقِ فسوں کار مسلّط بَر سَر
ہاں ہجر ترا وصل سے ہے افزوں تَر
یادوں کے خزینے کو چھپایا دل میں
بیٹھا ہے کوئی سانپ، مری چھاتی پر



طائرکوئی قسمت میں نہیں، ڈھال ہوں میں
سکہ ہوں نہ رائج ہوں، کہن سال ہوں میں
اک فصل رسائی کہ مقدر میں نہیں
ہوں سبزۂ نو خواستہ، پامال ہوں میں





ہر بات میں انداز، تاسف کی طرح
یہ ملنا بھی ملنا ہے، تکلف کی طرح
شاداب دل وجاں کا گلستاں کرنے
آجاؤ! کبھی عیش وتلطّف کی طرح



دھند لایا ہوا آنکھ کا منظر نکلا
سایہ بھی مرے قد کے برابر نکلا
اے پائے طلب، جہت شناسی کی قسم
ہر نقش قدم راہ کا، پتھر نکلا





ہاں طاق یہ اِک شمع، دھری رہنے دے
بجھتی ہوئی لو میں، تھرتھری رہنے دے
شاید کوئی موسم اے بخشے گا ثمر
اس شاخِ تمنا کو ہری رہنے دے



ہاں اُس نے مجھے چھوڑ کے با حالِ تباہ
گہہ کنویں جھنکائے ہیں اور گاہے چاہ
یہ حال ہوا ہے تیری فرقت میں مرا
اب خود سے بھی ہوتا نہیں ہے میرا نباہ

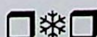




جینے کا ولولہ برابر رکھنا
بنیادِ ہوا پہ، ریت کا گھر رکھنا
پھولوں میں تلے جاؤں گے جن لوگوں سے
ان لوگوں سے اُمیدِ خنجر رکھنا



ہر لحظ نئے سانچے میں، ڈھلتی ہے یاد
ناگن کی طرح دودھ میں، پلتی ہے یاد
خوشبو کی طرح پھیلتی ہے نَس نَس میں
صندل کے تلے پھولتی پھلتی ہے یاد





ہے چاروں طرف ریت پڑی، دھوپ میں ہوں
اندیشوں کی دھرتی پہ بڑی دھوپ میں ہوں
سورج کہ اُتر آیا، سوا نیزے پر
سایا نہ کوئی سر پہ، کڑی دھوپ میں ہوں



اُڑتے ہوئے لمحات کی گردش، اور میں
موہوم خیالات کی لرزش ، اور میں
رفتار ہے کج پائے طلب کی شاید
بے سود شب وروز کی ورزش، اور میں





پیدا پہ یہاں شور ہے، پنہاں پہ شغب
جینے کا نہ مقصود، نہ مرنے کا سبب
اک بوجھ لئے پھرتا ہے سر پر آدم
دنیا کی تمنّا ہو کہ عقبیٰ کی طلب



حالات کی چھلنی میں اسے چھان لیا
ہاں زیست کو ہر رنگ میں پہچان لیا
گر آبِ بقا بھی ہو، نہ میں منہ کو لگاؤں
یہ ٹھان لیا، ٹھان لیا، ٹھان لیا





مفہوم طلب غرض نہ غایت ہوگی
جزایں کہ پذیرائیِ کلفت ہوگی
انصاف کے والی یہ ذرا بتلا کب
بے جرم اسیروں کی سماعت ہوگی



ہر پھول کے ہاتھوں میں یہ ساغر دے گی
گاہے گاہے نہیں، یہ اکثر دے گی
شبنم میں دھلی عشق کی تاثیر فریدؔ
بے رنگ ہوں ، با رنگ مجھے کردے





مقسومِ طلب بادۂ خالی ہی دیا
دامان تہی ہات سوالی ہی دیا
الحمد کہ سیراب ہوئی تشنہ لبی
ساغر نہ دیا، جامِ سفالی ہی دیا



ہر چند لڑے موجِ بلا سے مجبور
تھم جائے ! ہو جب آئینۂ ہستی چور
یہ بحر محبت ہے نہایت ہی عمیق
تنکوں کے سہارے پہ نہ جا اتنی دور





آپ اپنی ہی دنیا میں، مست ہوں میں
غرقاب مئے شوق وطلب ہست ہوں میں
دیتی ہے یہ آواز مجھے مدہوشی
اب ہوش کی منزل سے، بیک جست ہوں میں



پھر پیرہن جاں کی مہک آنے لگی
کافر کو ایماں کی مہک آنے لگی
ہیں روحِ فزا بادِ صبا کے جھونکے
کس سمت سے انساں کی مہک آنے لگی





شوریدگیٔ عشق کے اظہار پہ ناچ
ناکام طلب، وصل کے انکار پہ ناچ
اک جذبۂ صادق کا تقاضا ہے نہ ڈر
جو سر پہ گرے گی، اسی تلوار پہ ناچ



آئینہ مصفّا ہوں میں، حیرت کی قسم
یہ ایک صداقت ہے، صداقت کی قسم
قدسی بھی مرے آگے ہوئے سربسجود
ابلیس کی اُس گردِ کدورت کی قسم





اکثر میں یہاں مثلِ سمندر[1] آیا
ہاں دائرہ عقل سے باہر آیا
لوہے کے چنے چبانا ہے عشق فریدؔ
جو کر نہ سکا کوئی وہ میں کر آیا



دنیا نئے سانچے میں ڈھل جائے گی
ہاں فطرتِ آدم بھی سنبھل جائے گی
حالات بدل جائیں گے پھر اس کے بعد
اس ظلم کی بنیاد بدل جائے گی

۱۔ سمندر: آگ میں پلنے والا کیڑا





بے ٹھور ہوں، کوئی نہ مکاں میرا ہے
کہنے کو زمیں اور زماں میرا ہے
اٹکھیلیاں کرتا ہوں کبھی پھولوں سے
صحرا میں ہوں تو ریگِ رواں میرا ہے



پرشور گہے ظلم کے بازار میں ہوں
گہہ رقص کناں حسن کے دربار میں ہوں
گہہ پیستی ہے وقت کی چکّی مجھ کو
گہہ تیز قدم وادیٔ پرخار میں ہوں





برہم ہوا اب عیش کا شیرازہ ہوا
مرجھانے لگا باغِ تر وتازہ ہوا
صحرائے لق ودق ہے مرے چاروں طرف
قربت کا بھگت رہا ہوں خمیازہ ہوا



تاروں کی رفاقت سے سمٹ جانا ہے
کھلتے ہوئے آکاش پہ گھٹ جانا ہے
تکمیل تسلسل کی، اسے کہتے ہیں
مرکز کی طرف پھر سے، پلٹ جانا ہے





پروانہ صفت، نور کا میں طالب ہوں
مٹی ہے خمیر، آگ پہ میں غالب ہوں
کندن سا دمکتا ہے مرا روحِ وجود
میں عشق ہوں اور عشق کا قالب ہوں



پروانہ صفت اب آتشِ طور میں جل
خاکِ رہ جاناں کو منہ پر مل
گر عشق عناں گیر نہ ہو کیفِ حیات
کچھ بھی نہیں دیتا، بجز اندازِ خلل



سرمدؒ[1] کے مزار پر

اے شاہِ جنوں، تیرے عرفاں کو سلام
اے چاک جگر، اُس تن عریاں کو سلام
حشمت کا طلب گار نہ تھا جاہ پسند
غارت گریٔ عیش وساماں کو سلام

ا۔ مشہور صوفی شاعر سرمدؔ کا اصل نام محمد سعید تھا۔ سرمدؔ کو اگر ہندوستان کے فارسی رباعی گو شعراء کا ''سرآمد'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مراۃ الخیال اور والہ ؔداغستانی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سرمدؔ کا شان سے ہندوستان بغرض تجارت آئے تھے لیکن یہاں لعل والماس فروخت کرنے کے بجائے دِل وجگر فروخت کرنے لگے۔ یعنی وہ ٹھٹھ (سندھ) کے ابھے چند نامی لڑکے پر عاشق ہو گئے اور کچھ ایسا جنون سوار ہوا کہ عریاں رہنے لگے۔ اکثر ان کی زبان پر یہ شعر بھی رہا کرتا تھا ؎

نمی دانم کہ سرمد اندریں دیر
خدائے من ابہ چند است یا غیر

اس زمانے میں شاہجہاں تختِ دہلی پر جلوہ افروز تھا۔ سرمدؔ کی ولایت کا شہرہ سن کر اس نے اپنے مصاحب عنایت خان آشنا کو بھیجا کہ سرمدؔ سے ملے اور اس کی کشف وکرامات کا حال معلوم کرے۔ عنایت خان نے وہاں برہنگی کے سوا کچھ نہ دیکھا اور واپس آکر یہ شعر پڑھا ؎

برسرمد برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ظاہر است ازو کشفِ عورت است

☆☆☆



شاہانہ تخت وتاج ' ٹھوکر پہ مری
دجّال کا تاج راج ' ٹھوکر پہ مری
حشمت کا طلب گار' نہ ہوں جاہ پسند
دُنیا کا کام کاج ٹھوکر پہ میری



ہاں ڈھونڈنے نکلا تھا میں آبِ حیات
پیاسا ہی پڑا آنا پلٹ کر ہیہات
اِک بار قدم درک کی سرحد پہ پڑا
ڈستے ہیں مجھے اب بھی جنوں' کے لمحات





دارا[1] کے سوا کون یہاں سمجھے گا
اے میرے خدا، کون یہاں سمجھے گا
غوغائے الا اللہ ہے مرے لا پہ محیط[2]
بے کس کی نوا کون یہاں سمجھے گا

۱- داراشکوہ سے سرمد کو خاص انسیت تھی۔ چونکہ دارا بھی صوفیانہ خیالات رکھتا تھا اسی وجہ سے ان دونوں میں گہرے مراسم تھے۔

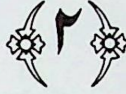
۲- سرمد کی عادت تھی کہ جب وہ کلمہ طیبہ پڑھتا تھا تو لا الہ سے آگے نہیں پڑھتا۔ چنانچہ جب علماء نے سرمد سے کلمہ طیبہ پڑھنے کے لئے کہا تو اس نے لا الہ سے زیادہ نہ پڑھا کہ کلمہ نفی ہے۔ اس پر علمائے وقت نے اعتراض شروع کیا تو سرمد نے کہا کہ ابھی میں نفی میں مستغرق ہوں مرتبۂ اثبات تک نہیں پہنچا۔ جب پہنچوں گا تو الا اللہ بھی کہوں گا۔ علماء نے فتویٰ دیا کہ فقط لا الہ کہنا کفر ہے۔ اگر سرمد توبہ کرے تو ٹھیک ورنہ واجب القتل۔ سرمد نے توبہ نہ کی۔ چنانچہ دوسرے روز سرمد کو قتل کیلئے جامع مسجد کے سامنے لے گئے۔ کہتے ہیں کہ قتل کے وقت سرمد بڑا ہشاش بشاش تھا۔ جلاد سامنے آیا تو اسے مسکرا کر کہا:

"فدائے تو شوم۔ بیا بیا کہ بہر صورتے کہ مے۔ آئی من ترا خوب مے شناسم"

یہ کہا اور ذیل کا شعر پڑھ کر تلوار کے نیچے گردن رکھ دی ؎

شورے شد واز خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی است شبِ فتنہ غنودیم





ماحول ترے شہر کا یاد آتا ہے
واللہ بہت دل مرا گھبراتا ہے
ہے تیغ وسناں سر پہ ترے لیکن تو
بے خوف ہے اور رقص جنوں فرماتا ہے

سرخوش اپنے تذکرے میں لکھتا ہے کہ ایک دن میں اور ناصر علی سرہندی اور مرزا عبدالقادر بیدلؔ جامع مسجد دہلی میں حوض کے کنارے بیٹھ کر شعر خوانی کر رہے تھے کہ سرمدؔ آیا دیکھ کر مسکرایا اور یہ شعر پڑھا۔

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار ورسن را

چنانچہ اس کے جلد ہی بعد قتل ہوا۔

☆......................رودِکوثر۔شیخ محمد اکرام؛ص 437



پھر قید میں اک دائرہ پُرکار میں ہوں
وادی میں مگر وادیٔ پُرخار میں ہوں
زخمی ہے مرا سینہ، تری یادوں سے
اے شوخ ادا شوخیٔ گفتار میں ہوں



ماضی کو کسوٹی پہ پرکھ لینا کیا
یوں ذائقہ یاد کو چکھ لینا کیا
جھونکا سا گزرتا ہے، دل وجاں کے قریب
دروازہ بند آنکھ کا رکھ لینا کیا





نظارہ گیا، چشم تماشا بھی گئی
خواہش کی قسم، دل کی تمنا بھی گئی
پھینکا وہ فلاسنگ فلک نے پتھر
سامانِ طرب، عیش کی دنیا بھی گئی



ہاں تیری تمنا میں بھٹکتا میں ہوں
مر مر کے تری خاطر جیتا میں ہوں
آہو کی طرح زقند بھرنے والے
اک نقطہ موہوم پہ ٹھہرا میں ہوں





ساقی ہے بکف، ساغرِ جم، لینے دے
بھر پور سہی، بیش نہ کم لینے دے
وہ حور بہشتی ہے ابھی پہلو میں
عصیاں کی گھنی چھاؤں میں دم لینے دے



تسکین دل اور روح کا آرام پلا
کم ہوگی ذرا سختیِ ایام پلا
رگ رگ میں کھچی جاتی ہے تشنہ لبی
ساغر کی قسم جام پلا جام پلا





پُرہول مناظر میں گری رہتی ہے
دُشمن کی طرح ، اپنا بنا لیتی ہے
مرنے کا قصد جب بھی کرتا ہوں فرید
رستے میں، میرے زندگی پڑتی ہے



موسم ہے تر و تازہ، مے و جام لے آ
دل اور نظر کے لئے آرام لے آ
کانٹوں پہ لٹاتی ہے مجھے جس کی یاد
وہ چہرۂ رنگیں ، وہ خوش اندام لے آ





ہیں خوف کے آثار، یہاں پر موجود
تیروں کی ہے بارش، ہوں جہاں پر موجود
اس شہرِ طلسمات میں کھوجوں کب تک
مفقود کہاں پر ہوں، کہاں پر موجود



کھلنے کی تمنّا، نہ نمو کی ہے للک
آوارہ صبا ہوں، نہ پریشان مہک
تدبیر کا پھندا ہے گلے میں میرے
تخلیق! غم و یاس کی، کرتا ہے فلک





اِک رنگِ شکستہ ہی ، صانع ہوتا
ہاں جہد مسلسل میں یہ مانع ہوتا
بجھ کے رہ جاتی مری شورہ طلبی
میں موت پہ یا زیست پہ قانع ہوتا



سائے سے بھی رم خوردہ ہوں، آہو کی طرح
بے ٹھور ٹھکانا ہوں خوشبو کی طرح
جس نور سے نکلا تھا اُجالا کرنے
جلتا ہوں اُسی آگ میں، جگنو کی طرح





پروانے سے رقص بھی کرنا سیکھا
اور آگ کے دریا سے گزرنا سیکھا
خاموش جلا کرتا ہوں میں، شمع صفت
چاہت کا سبق، عشق میں مرنا سیکھا



اللہ تحیّر، یہ زیاں خانے کا
اِک خواب، حقیقت میں ہے دیوانے کا
ہر رنج وخوشی یاں کہ ہوا پر ہے سوار
عاقل ہے وہ، جو راہ لے میخانے کا





شیرازہ دل وجاں کا بکھر جائے گا
دل آگ کے دریا سے گزر جائے گا
حالات کسوٹی پہ پرکھتے ہیں مجھے
ہیہات سبھی رنگ اُتر جائے گا



پرشور تلاطم سے گزرنا ہے مجھے
ہاں ڈوبنا ہے اور اُبھرنا ہے مجھے
اے مجھ سے بچھڑتی ہوئی دنیا آخر
آنا ہے پلٹ ! قیام کرنا ہے مجھے





جب حشر میں ہوں پیش عمل کے دفتر
لرزیدہ ترے قہر سے ہوں جن وبشر
پروانہ ترے عشق کا ہوگا مرے ہاتھ
کہہ دوں گا! ذرا شمار اس کا بھی کر



دشمن کے لئے تیغِ کشیدہ ہوں میں
اپنوں کے لئے قوسِ خمیدہ ہوں میں
ان دونوں کے ہر نوش میں ہے نیش فریدؔ
یہ مار ہیں؛ اور مار گزیدہ ہوں میں





لو ڈوبا ہے مغرب میں شرارا کوئی
روشن ہوا پھر چاند، نظارا کوئی
ہر شام طلب کرتا ہے وہ مجھ سے مجھے
ہے نفع کہ اس میں، ہے خسارا کوئی



ہاں پاس میں مانگے کا اُجالا نکلا
مہتاب بھی اِک نور کا ہالا نکلا
تائید میں جس عمل کے ہے دنیا سب
رد کرنے اسے ' میرا حوالہ نکلا





سورج کو دی تنویر، مجھے کچھ نہ دیا
پھولوں کو دی تصویر، مجھے کچھ نہ دیا
گونگا ہوں، ہر اِک خواب ہے میرا مہمل
بے چہرہ ہے، تعبیر مجھے کچھ نہ دیا



ہے گرم سفر قوسِ خمیدہ، پر ذات
درپیش ہے بس ایک مشقت، دن رات
مانگے کا اُجالا ہی سہی اُس نے فریدؔ
بھیجے نہ کبھی مجھ کو، خوشی کے لمحات





ٹھہرا ہوں میں ہی ہدفِ نظر، پوری طرح
گھائل ہے دل وجان وجگر، پوری طرح
سو رنگ سے غالب ، ہے تمنا اُس کی
کاٹے ہیں مری سوچ کے پر، پوری طرح



آپ اپنے سے لڑتا ہوں ، پاگل کی طرح
ہاں کام ملا، جہدِ مسلسل کی طرح
ہوں پیاسی زمینوں کا طلب گار فریدؔ
گردش ہے مرے پاؤں میں، بادل کی طرح





میثاقِ ازل! مُکر نہ جائیں ہم لوگ
حد سے آگے گزر نہ جائیں ہم لوگ
ریتیلے گھروندوں کے محافظ ہیں ہم
اے تیز ہوا، بکھر نہ جائیں ہم لوگ



بے حس تھا دل و جاں، وہ پلٹ کر آیا
تھا دھوپ میں عریاں، وہ پلٹ کر آیا
ماضی کی گھنی چھاؤں مہیا کردے
اے گردشِ دوراں، وہ پلٹ کر آیا





خوشبو کا قاصد ہوں، صبا میری ہے
شبنم کے کٹوروں میں دعا میری ہے
یادوں کے سہارے پہ جیا ہوں اب تک
ہوں مرغ، مگر آگ غذا میری ہے



زخموں سے بدن خانۂ زنبور کیا
جو وار کیا اس نے، وہ بھر پور کیا
شیشے کا کھلونا تھا مرے ہاتھوں میں
ہاں سنگِ حوادث نے، اسے چور کیا





ساغر ہے، قرابا ہے مغاں گردش میں
گردش میں زمیں ہے، آسماں گردش میں
تقدیر بدل، رندوں کی صحبت میں آ
میخانے میں ہر این وآں گردش میں



بے چہرہ، تمنا کی نمائش نے کیا
سیپی کے لئے، گہر کی خواہش نے کیا
ہاں تیری طلب میں مجھے سرگرم ستیز
فرقت کے شبِ، محنت و کاوش نے کیا





ساغر ہے' قرابا ہے مغاں گردش میں
گردش میں زمیں ہے' آسماں گردش میں
تقدیر بدل' رندوں کی صحبت میں آ
میخانے میں ہر ایں وآں گردش میں



بے چہرہ 'تمنا کی نمائش نے کیا
سیپی کے لئے' گہر کی خواہش نے کیا
ہاں تیری طلب میں مجھے سرگرم ستیز
فرقت کے شبِ' محنت و کاوش نے کیا





ہے جبر کے ہاتھوں میں مقیّد آدم
پتلی کی طرح ناچ نچائے ہر دم
قسام ازل نے نہ کیا کچھ بھی عطا
جز حسرت و اُمید و تمنا' ماتم



اس خواب کی تعبیر سے اب کیسے ڈروں
خاکہ ہے ہوا کا' اسے کیا رنگ بھروں
اس درجہ ہوں بددل میں گلی سے اس کی
کعبہ بھی ہو اِس طرف، کبھی منہ نہ کروں





ہے جبر کے ہاتھوں میں مقیّد آدم
پتلی کی طرح ناچ نچائے ہر دم
قسام ازل نے نہ کیا کچھ بھی عطا
جز حسرت و اُمید و تمنا، ماتم



اس خواب کی تعبیر سے اب کیسے ڈروں
خاکہ ہے ہوا کا، اسے کیا رنگ بھروں
اس درجہ ہوں بددل میں گلی سے اس کی
کعبہ بھی ہو اِس طرف، کبھی منہ نہ کروں





خوشبو اور رنگوں کی سواری پھر آئی
گلشن کی طرف بادِ بہاری پھر آئی
منہ کھلنے لگے پھر سے ہرے زخموں کے
ہاں بھولی ہوئی یاد تمہاری پھر آئی



فطرت سے ہوں بیباک، کم آمیز مزاج
ہوں تیز قدم ، تیز نظر، تیز مزاج
ہاں دشت وجبل تنگ ہے وحشت کو مری
کس جا پہ خروشاں ہوں، جنوں خیز مزاج





داماندہ شب ہجر کی کلفت سے ہوا
ہاں نقش بہ دیوار میں، حیرت سے ہوا
سو چاند اُتر آئے ہیں، دل میں میرے
خاموش کواکب کی معیّت سے ہوا



تکمیل زیاں کی نہ کبھی سود سے لکھ
ہر ہست کا عنواں، قلم بود سے لکھ
لو دیتی جوانی یہ تعیش یہ شباب
انجام ہر ایک شعلے کا، دود سے لکھ





آئینہ ہوں میں، مجمع ہوں حیرت کا
اِک درس، مگر درس ہوں عبرت کا
پیمانہ تھا میں گیتی نمایندہ ولیک
ہے چور ہر اِک شیشہ مری قسمت کا



دم گھٹنے لگا تیز ہَوا کے ہاتھوں
دل دُکھنے لگا تازہ فضا کے ہاتھوں
جو دھوپ کی حدت سے بچایا تھا وہ پھول
پژ مردہ ہوا بادِ صبا کے ہاتھوں





اورنگِ سلیماں پہ کبھی سیر کرے
ہاں قید حرم، گاہ گہے دیر کرے
لیکن ہے مری ذات تنوع طالب
بنیاد ہوا پر ہے، خدا خیر کرے



یکساں تری یاد میں ہے غیب وحضور
فطرت ہے مری تیرہ، نہ ہی باطن کور
میں حال میں ہوں مست، نہ ہی مال میں مست
بخشا یہ مجھے تیری تمنا نے شعور





منزل ہے دُور، شام ہے ہوں محوِ سفر
اب کیسے کروں زیست کا میں معرکہ سر
اس رہ میں مسافر کے تعاقب میں ہیں
جلتے ہوئے منظر ہوں کہ بے سایہ شجر



فریاد کی لے داد کا معیار بدل
بازار اُتر جائے تو بازار بدل
ہاں قید کی معیاد اگر کم بھی نہ ہو
پھر حلقۂ زنجیرِ گرفتار بدل





پتلی میں جہاں بھر کو یونہی قید کیا
گاگر میں سمندر کو یونہی قید کیا
کشتی کے بہانے کبھی ساحل کے لئے
لہروں نے شناور کو یونہی قید کیا



شیشہ ہوں میں اور تو ہے شیشہ ساز
میں ایک کھلونا ہوں تو ہے لعبت باز
ہوں جبر کی تختی پہ بہ تکرار رقم
ازروئے حقیقت ہوں کہ ازروئے مجاز





قمری کی طرح غل بھی مچایا میں نے
بیّا[1] کی طرح گھر بھی بنایا میں نے
کھیلے ہیں بہت کھیل سدھا کر خود کو
اِک عمر کو دھارے پہ بہایا میں نے

۱- بیا غیر مشدد ہے مگر شعری ضروریات کی بناء پر اسے مشدد گردانا گیا ہے۔ ایک چھوٹا سا لیکن نہایت ہی ہنر مند اور عقل مند پرندہ ہے۔ یہ عام طور پر چھ انچ کے قریب، پَر خاکی رنگ کے اور نچلا حصہ زردی مائل ہوتا ہے۔ رائی اور اس قسم کے ننھے دانے اس کی خوراک ہیں۔ اونچے اونچے درختوں پر ایسی کاریگری سے گھونسلا بناتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ برسات کی اندھیری راتوں میں جگنو پکڑ کر لے جاتا ہے اور اس کی روشنی سے اپنے گھونسلے کو منور کرتا ہے۔ لوگ اسے پالتے ہیں اور طرح طرح کے کرتب دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ بڑا ہوشیار اور چالاک پرندہ ہے، جو سکھاؤ سیکھ جاتا ہے۔



بے آب کبھی ہجر کی شمشیر تو ہو
پیدا کہ ہر اِک نالہ میں تاثیر تو ہو
اے کاش تفاوت کی یہ دیوار گرے
شرمندہ اِس اِک خواب کی تعبیر تو ہو



ہوں ذات کہ عین ذات، معلوم نہیں
ہو وصف کہ ہوں صفات، معلوم نہیں
مسجود فرشتوں کا یارانۂ خلد
ہوں فتنہ کہ ہوں ثبات، معلوم نہیں





ہاں جبر کے ہاتھوں میں مجبور ہوں میں
پھر جبر کی ظلمت کا مقہور ہوں میں
جھٹلانے لگا وقت کا فرعون مجھے
موسیٰ ہوں تجلّی ہوں یا، طور ہوں میں



ماضی کے عذابوں کی طرح، یاد نہ آ
ہاں سوکھے گلابوں کی طرح، یاد نہ آ
جن میں مرا ماضی ہے ترے قرب کے پھول
ان بھولی کتابوں کی طرح یاد نہ آ





طوفانِ حوادث میں بکھرتا ہے وجود
اِک آگ کے دریا سے گزرتا ہے وجود
ہے غولِ بیاباں کا تعاقب شب و روز
اس تیرہ خاک داں میں ڈرتا ہے وجود



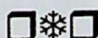
جھکڑ کبھی چلتے ہیں، کبھی اُٹھتی ہے موج
عارف کی نظر ہے، کبھی عاقل کی کھوج
موہوم خیالات کچلتے ہیں مجھے
لشکر ہے یہاں کوئی نہ ہے کوئی فوج



گفتگو چاند سے



جینے کا نہ سیکھا ہے قرینا میں نے
خشکی میں ڈبویا ہے سفینہ میں نے
کرتا ہوں غلط زیست کے غم، مے سے فریدؔ
رندوں سے نہ سیکھا ہے جینا میں نے





فرید پربتی اُردو ادب کے اُن پرستاروں میں سے ہیں جنہوں نے بیک وقت شعر و نثر دونوں میں اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ ہماری ادبی روایت میں Versitility کی مثال زیادہ نہیں ملتی۔ فرید پربتی کو پڑھ کر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جنہوں نے بیک وقت ایک بہت اچھے شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے اپنی انفرادیت اور شناخت قائم کی۔ خلیل صاحب کے ساتھ فرید کا ذکر یوں بھی مناسب لگتا ہے کہ دونوں نے غزل سے نسبتاً زیادہ سروکار رکھا ہے لیکن نظم بھی کہی ہے اور نثری مضامین کی حد تک صرف ادبی تنقید لکھی ہے۔ فرید نے رباعیات بھی لکھیں جس کے فنّی و تخلیقی تقاضے مشکل سمجھے جاتے ہیں۔ خلیل صاحب نے بہت اہم منتخب اور اچھوتے موضوعات پر کافی غور و خوض کے بعد اپنے خاص انداز میں نہایت دلچسپ اور کارآمد تنقیدی مضامین لکھے جن سے اُردو تنقید کو نہ صرف فائدہ ہوا بلکہ تازگیٔ فکر و خیال کی حد تک تنقید کی روایت میں اضافہ بھی ہوا۔ فرید نے بھی قدیم و جدید ادب کے گہرے مطالعے اور سنجیدہ تفہیم کے نتیجے میں بعض بہت اہم اور قابل قدر مضامین لکھے جن سے ادبی تنقید کے سرمایے میں بہت اضافہ ہوا۔ فرید پربتی کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ جز وقتی ادیب یا شاعر نہیں بلکہ مسلسل اور لگاتار وہ پورے انہماک اور تندہی کے ساتھ اپنے ادبی ذوق کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ اپنے اس سنجیدہ اور کسی قدر ہمہ جہت ادبی شغف کے اعتبار سے سرزمین کشمیر میں یقیناً وہ اس روایت کے امین اور پیرو کہے جاسکتے ہیں، جس کی اعلیٰ ترین مثال حامدی کاشمیری ہیں جو اپنی بے پناہ دانشورانہ اور اخلاقیانہ صلاحیتوں اور کارناموں کے سبب برصغیر کے ممتاز ترین ادبی شخصیتوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

فرید پربتی چونکہ پچھلے پچیس تیس برسوں سے لگاتار لکھ رہے ہیں اور ان کے چند شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے ان کے مجموعہ ''آبِ نیساں'' کے حوالے سے اپنے ٹوٹے پھوٹے خیالات کا اظہار پہلے بھی کیا تھا جیسا کہ میں شروع سے محسوس کرتا ہوں فرید پربتی

اپنے والد کے نام

لِکلِ جدیدٍ لذۃٌ غیر أنّنی
رأیتُ جدیدَ الموت غیر لذیذ

(ضابی بن الحرث الیربوعی)

(ہر نئی چیز اچھی لگتی ہے البتہ موت ایسی
نئی چیز دیکھی جو بڑی بدمزہ ہے)

دے رہا تھا کوئی رہ رہ کے صدا یاد آیا
رات چلتی تھی بہت تیز ہوا یاد آیا

اسی راستے پہ کبھی میں نے جلائے تھے چراغ
اسی رستے پہ کبھی میں تھا کھڑا یاد آیا

ربط پیدا اس قدر اس یارجانی سے ہوا
وہ خفا مجھ سے میں اپنی زندگانی سے ہوا

چہرہ پردے سے جو اس رشک قمر کا نکلا
ہر کوئی کہنے لگا چاند کدھر سے نکلا

پہلا شعر اپنے اسلوب کی نوافگنی کے سبب غضب کی کشش اور تاثیر کا حامل ہے جس میں تیز ہوا کے اضافے سے درد و کسک اور مخزونی کی کیفیات شعر کو مزید دلآویز بنا دیتی ہیں۔ تاہم بقیہ اشعار یقیناً روایتی طرز کے حامل ہیں البتہ نئے دور میں برملا اور بے محابہ اظہار عشق کی روایت کے سیاق میں شوخی، لگاؤ اور سپردگی کا یہ سنبھلا ہوا انداز بڑا پر لطف معلوم ہوتا ہے۔

فرؔید کے یہاں خواب کی معنویت بھی کافی غور طلب ہے دیکھیں یہ اشعار۔

ہر گھنے سایے کو بے نام ونشاں کرتا ہوا
وقت گزرا خواب میرے رائیگاں کرتا ہوا

نے کشمیر میں رہتے ہوئے وہاں کے سیاسی وسماجی منظرنامے کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی خود کو صرف کشمیر کی حد تک محدود رکھنا پسند نہیں کرتے اس کے برعکس وہ اپنی شناخت پورے ملک بلکہ وسیع تر کائنات اوراس کے لامحدود افکار وعلائق سے قائم کرتے نظر آتے ہیں اس لحاظ سے ان کے یہاں ایک آفاقی شعری تناظر کی بھی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ دوسرا پہلو جو اس شاعری خصوصاً غزل اوراس کے صنفی خصوصیات کے حوالے سے اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعری حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے اور Partision کردار ادا کرنے کے بجائے نسبتاً Neutral انداز کی حامل ہے جو اپنے قاری کو فکر کے خاص زاویے میں مقید کرنے کے بجائے اس کو کھلا چھوڑ دیتی ہے تا کہ وہ خود فیصلہ کرے اور کسی نتیجے پر پہنچے۔ فرید پربتیؔ کے زیر نظر مجموعہ ''گفتگو چاند سے'' بالعموم غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں شہر آشوب بھی شامل ہے جو نظم ہونے کی حیثیت سے بعض ناگزیر فوری زمانی ومکانی حوالوں سے معمور ہے۔ مجموعہ کا عنوان اگرچہ رومانی ہے لیکن شعری کائنات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رومانس کسی محدود معنی میں نہیں ہے اس میں وسعت اور فراخی ہے یہ زندگی اوراس کے بے شمار مظاہر وممکنات سے گہرے تعلق اور سروکار سے عبارت ہے۔ شاعری اور وظیفہ عشق انہیں معنوں میں لازم وملزوم ہیں کہ یہ وہ مرحلۂ شوق ہے جس سے دامن کشیدہ گزر جانا ممکن نہیں ہے۔ فرید پربتیؔ اس رمز سے باخبر ہیں۔ شیفتگی کے اس وسیع تر تناظر میں ان کا یہ شعر دیکھیں ۔

کون آتا ہے مری راتوں کو کرنے معتبر
کون جاتا ہے مری شمعیں دھواں کرتا ہوا

راتوں کو معتبر اور شمعیں دھواں کرنے کی مختصر لفظیات خصوصاً آنے جانے کے افعال کے ذریعہ وصال ہجر کے گہرے پیچیدے جذبات واحساسات کی مصوری استعارہ سازی اور تمثال سازی کی کیسی نایاب مثال ہے۔

شاعر کے عشقیہ واردات Evcounters کی نمائندگی بعض دوسرے اشعار سے بھی ہوتی ہے ۔

ان اشعار کی وساطت سے شاعری کی منفرد و فنی تخلیقی بصیرت، گہرے جمالیاتی شعور اور احساس اور روحانی اضطراب کی خوب صورت ترجمانی ہوتی ہے۔

ان جستہ جستہ اشعار کے جائزے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ فریدؔ پربتی ہمارے ان شاعروں میں ہیں جو ایک آفاقی وژن رکھتے ہیں۔ نبض کائنات پر ان کی انگلیاں اس انداز سے پڑتی ہیں کہ وہ زندگی کی تھرتھراہٹوں کو محسوس کر کے آلام کی عقدہ کشائی پورے وثوق کے ساتھ کرتے چلے جاتے ہیں۔ خدا کرے اس سرزمین تخلیق سے نغمے یونہی اُبلتے رہیں اور قلب وجگر کی وادیاں سیراب ہوتی رہیں۔

نئی دہلی   پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی

یکم اپریل 2005ء



لے کے نکلا ہوں میں پھر سوختہ خوابوں کا جلوس
خود تماشائی بنوں خود ہی تماشا ہو جاؤں

یہ اشعار بھی گہری معنویت سے قطع نظر اپنے اسلوب کی ندرت اور پیرایہ اظہار کی دلآویزی کے سبب نظروں کو پابند حجاب کرتے ہیں چنانچہ وقت کے تناظر میں گھنے سائے کا بے نام ونشاں ہونا خواب کا رائیگاں ہونا اور دوسرے شعر میں ''سوختہ خوابوں کے جلوس کا منظر'' جس میں خود شاعری کی اپنی ذات تماشا بھی ہے اور تماشائی بھی۔ شعری اظہار کی وہ نادیدہ صورتیں ہیں جو ہم عصر شعری مناظر نامے میں دور سے پہچانی جاسکتی ہیں۔ فرید پربتی کے یہاں شعری تجربات کی بعض دوسری صورتیں بھی ملتی ہیں، جو اُن کے فنی وفکری امتیازات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

تنہا ہوں چار سمت ہے یلغار تیرگی
میں ایک چراغ ہوں تہہ داماں نہ رکھ مجھے

مقامِ صبر ورضا ہو کہ راہِ حق کی تلاش
حسینؑ ابن علیؑ کا یہ قافلہ آگے

وہ ایک موج جو ضامن نشاط روح کی تھی
اسی نے چھین لیا مجھ سے آخرش غم بھی

غموں کے موسم گزر چکے تھے
نہ جانے پھر کیوں اُداس تھا میں

خود ہی رکھتا ہے ہے دیے تیز ہوا کی زد پر
اور آندھی سے خبردار بھی کردیتا ہے

بِسمِ اللہ الرَّحمٰن الرَّحیم

بے برگ و بے نوا ہوں پریشاں نہ رکھ مجھے
اس چلچلاتی دھوپ میں عریاں نہ رکھ مجھے
اپنوں نے مجھ کو ڈال دیا اندھے کنوئیں میں
مفلس کا مال ہوں سر نسیاں نہ رکھ مجھے
اندیشہ نفع کا بھی ضرر بھی بدل گیا
مصرف زدہ ہوں بے سرو ساماں نہ رکھ مجھے
تاریک اَبکے زیست کے لیل ونہار ہیں
محروم روشنی مہہِ تاباں نہ رکھ مجھے
تنہا ہوں چار سمت ہے یلغار تیرگی
میں اک چراغ ہوں تہہِ داماں نہ رکھ مجھے
دوشِ ہوا پہ کاغذِ آتش زدہ ہوں میں
خاشاک صبح وشام پہ رقصاں نہ رکھ مجھے
اک چشم کیمیا کا طلب گار ہے فریدؔ
محروم فیض حضرتِ سلطاںؒ نہ رکھ مجھے

● سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدومؒ کاشمیری۔

اس اک ارادے پہ ہر اک سفر کیا موقوف
کہ اب جو ہوگا سفر ہوگا تیرے گھر کی طرف

نثار کیا کروں کچھ نہیں بہم شاہا
گرفتہ دل ہوں میسر ہے چشم نم شاہا

نہیں ہے خوف مجھے کچھ برستے تیروں کا
کہ میرے ہاتھ میں ہے اب ترا علم شاہاؐ

مری جبینؔ کی رونق فقط ہے خاکِ شفا
مری حیات کا حاصل ہے تیرا غم شاہاؐ

میں تجھ سے کرتا ہوں منسوب اِس لئے خود کو
چلے گا نام سے تیرے مرا درم شاہاؐ

نبیؐ نے گود میں پالا ہے تربیت بھی کی
اب اور کیا میں کہوں تو ہے محترم شاہاؐ

میں چل رہا ہوں صداقت کی سخت راہوں پر
یہ تیری دین ہے یہ ہے ترا کرم شاہاؐ

یہاں پہ جھوٹ ہمیشہ ہی معتبر ٹھہرا
یہاں ہیں سچ کے مخالف قدم قدم شاہاؐ



کوئی رسول نہ آئے گا اب رسولؐ کے بعد
نہ کوئی پھول کھلے گا اِس ایک پھول کے بعد

سبھی صحیفے ہوئے رد وہ اک صحیفہ ملا
بنا ہے ضابطہ قرآن ہی نزول کے بعد

وہ علم و حلم میں یکتا تھے ، خُلق میں قرآن
اصول کس کو کہیں گے اس اک اصول کے بعد

حِرا سے تا بہ اُحد سلسلے عبادت کے
قبول کس کو کہیں گے اِس اک قبول کے بعد

ترے حدیث وسنن میرے جزو ایماں ہیں
حصول اپنا سمجھتا ہوں اس حصول کے بعد

زمیں سخت تھی پھر بھی کہی ہے نعت فریدؔ
گناہ بخش دیئے جائیں گے قبول کے بعد

گماں بدوش وہیں پر تھی چشم پرنم بھی
صبا کے ساتھ جہاں داوٗ پر تھی شبنم بھی

اُس ایک بوجھ سے جھکنے لگے مرے شانے
جس ایک بوجھ سے اب تک رہا میں سرخم بھی

ہر اِک کمال کو دیکھا زوال آمادہ
شکست ہوگیا آخر پہ ساغرِ جم بھی

اُتر کے پار جلائیں گے کشتیاں اپنی
پھر اُس کے بعد منانا ہے اپنا ماتم بھی

وہ ایک موج جو ضامن نشاطِ روح کی تھی
اُسی نے چھین لیا مجھ سے آخرش غم بھی

یہ کس تلاش میں نکلا ہوں خود کو کھو کر مَیں
شعورِ ذات میں گم ہوگیا ہوں مدغم بھی

بیان کیسے کروں روحِ ابتلاء آگے
ہجومِ جورو جفا ایک بے نوا آگے

میں اب کے پیاس کی کھینچوں گا اس طرح تصویر
فرات ہوگا مرے پیچھے کربلا آگے

بنا کے اپنی نمازوں کا پہلے پیشِ امام
پھر اس کے بعد کیا قتلِ ناروا آگے

مقامِ صبر و رضا ہو کہ راہِ حق کی تلاش
حسینؑ ابن علیؓ کا ہے قافلہ آگے

وہ صلح جو تھے حقیقت میں، اَمن کے تھے نقیب
پیام و نامہ سے دنیا پہ وا ہوا آگے

فریدؔ عصر رواں بھی ہے کربلا آثار
یزید وقت کا انجام دیکھنا آگے



سکوتِ مرگ نہ شورِ ثبات سے مجھ کو
ملا رہا ہے کوئی میری، ذات سے مجھ کو

تقاضہ اس کے سلجھنے کا دن کرے گا ضرور
ہے ایک مسئلہ درپیش رات سے مجھ کو

وہ کوئی دوست ہے میرا کہ دشمن جانی
ڈرا رہاہے جو آبِ حیات سے مجھ کو

بہت دنوں سے کوئی خواب بھی نہیں آتا
چھڑا کے کون گیا ممکنات سے مجھ کو

جو میری راہ میں آسانیاں بچھاتا تھا
دوچار کرتاہے کیوں مشکلات سے مجھ کو

ابھی چھٹا ہی نہیں ہے غبار خوابوں کا
ابھی رکا ہی نہیں میرا شوقِ پیہم بھی

قفس سے چھوڑ کے کتنا کبیدہ خاطر ہوں
کہ مر گئی ہے یہیں خواہشِ دمادم بھی

امیر ہو کے یہی سوچتے ہیں لوگ یہاں
خرید لیں گے ضرورت کے وقت دَم خم بھی

فریدؔ امتّی میں آخری نبیؐ کا ہوں
حرام اسی لئے مجھ پر ہوا جہنم بھی





اک جلوۂ مہتاب ہے تشہیر میں شاید
گم ہوگیا ہوں اپنی ہی تعبیر میں شاید

اٹھتا ہے عجب درد مسلسل مرے دل میں
ہے ہاتھ اسی کا مری تعمیر میں شاید

آتے ہیں نظر خواب میں چاند اور ستارے
ہے گھر سے نکلتا مری تقدیر میں شاید

اک حلقہ بھی پڑتا نہیں جس کا کبھی ڈھیلا
اُلجھا ہوا ہوں اک اُسی زنجیر میں شاید

اب گوش برآواز ہوئے سارے گراں گوش
لذت ہوئی پیدا مری تقریر میں شاید

ہوتا ہے دکن میں کبھی دلّی کبھی جموں
رہتا ہی فریدؔ اب نہیں کشمیر میں شاید



تمہارے بارے میں چھوڑا ہے سوچنا میں نے
رہا نہ اُنس کوئی شش جہات سے مجھ کو

سخن سخن میں کھلاتا ہے پھول جو اکثر
ہوا ہے رنج بہت اُس کی بات سے مجھ کو

جو نقدِ جاں کی طلب ہو تو شوق سے دے دوں
نواز دینا وفا کی زکات سے مجھ کو

کوئی پیام گلوں کا نہ خوشبوؤں کی خبر
ملا نہ کچھ بھی صبا تیرے ہات سے مجھ کو

وہ کشتیوں میں مری چھید کرنے والا شخص
بچانے نکلا ہے اب حادثات سے مجھ کو





رفاقتوں کی زیاں کوشیوں سے بچ کے چل
وہ کہہ رہا ہے سیہ پوشیوں سے بچ کے چل

یہ بھاگ دوڑ علامت ہے زندگانی کی
ٹھہرتے لمحوں کی خامشیوں سے بچ کے چل

ہر ایک شخص کو چسکا لگا ہے غم کا یہاں
اِس ایک نوش کی مدہوشیوں سے بچ کے چل

اسی لئے میں اُٹھاتا ہوں بارِ رنج والم
کہا تھا اُس نے کہ کم کوشیوں سے بچ کے چل

یہ ایک عکس ہے میری شناختوں کی دلیل
نوید جاں کی فراموشیوں سے بچ کے چل



مَیں بھلا نہ سکوں گا کبھی بھی اُسے وہ ہمیشہ ہی میرا رفیق رہا
ہو گلابوں کی رُت کہ خزاں کا سماں وہ رفیق رہا وہ شفیق رہا

نہیں رہنے دیا کبھی ایک جگہ مرے حد سے زیادہ جنوں نے مجھے
ہوں اسیرِ گماں نہ ہی صیدیقیں مرا شوق ہزار طریق رہا

میں اُداس اُداس نہیں ہوں ذرا جو اُمید کا شہر نشانہ بنا
جو بھی رنگ دکھائے زمانہ مجھے اُسی رنگ میں مَیں بھی غریق رہا

ہوں امیر شرف نہ نجیبُ طرف نہیں کچھ بھی بکف ہوں فقیر نجف
مرا عصر بھی تھا، مرا قصر بھی تھا بڑی شان کا عہد عتیق رہا

کوئی بوند کرم کی وہاں پہ نہیں کہ وفا کے عوض ہے ستم پہ ستم
کبھی اِس پہ ہوں خوش کبھی اِس پہ غمیں مرا مسئلہ کتنا دقیق رہا

نہ خیال کسی کے ملال کا ہے نہ کسی کی جفا پہ خفا ہوں فریدؔ
میں ہمیشہ ہی مست الست رہا میں ہمیشہ ہی مردِ خلیق رہا





خواب اور طرح کے ہیں خیال اور طرح کے
آنکھیں ہیں وہی اُن میں سوال اور طرح کے

اپنے سے جدا ہو کے بھی زندہ ہیں یہاں لوگ
اِس شہرِ فسوں کے ہیں کمال اور طرح کے

قامت ہے جہاں پست وہیں سایہ ہے بالا
قسمت میں لکھے اب کے زوال اور طرح کے

وہ دن گئے ہوتی تھی فرومایۂ کلفت
موسم ہیں نئے اور ہیں ملال اور طرح کے

آسودۂ امکانِ طرب دل ہی نہیں ہے
جاری ہیں یہاں کربِ وصال اور طرح کے

ملنے کو تو ملتے ہیں مگر دل نہیں ملتا
رشتے ہوئے ہیں اب کے بحال اور طرح

کل تک جو محافظ تھے وہی اب ہیں مخالف
برپا ہیں جنگ و جدال اور طرح کے



کتاب زیست کا ہر صفحہ بے نشاں رکھ کر
اب اِس طرح نہ خطا پوشیوں سے بچ کے چل

نشہ حیات کا چھایا ہوا ہے چاروں طرف
سواد جاں کی ہم آغوشیوں سے بچ کے چل

ہے طعنہ زن وہی بیداریوں پہ اب کے فریدؔ
جو کہہ رہا تھا کہ بے ہوشیوں سے بچ کے چل





بے بسی میں چہرے تکتا خواہشوں کے رہ گیا
دوڑ میں آخر پہ سب سے میں ہی پیچھے رہ گیا

لے گیا ہے وقت مجھ کو مجھ سے کب کا چھین کر
سوچتا ہوں اب تلک زندہ میں کیسے رہ گیا

ایک سایہ کر رہا تھا میرا پیچھا دیر سے
منزلوں ہمراہ ہوکر چلتے چلتے رہ گیا

تولتا تھا خود کو وہ یا ناپتا تھا وسعتیں
اک پرندہ جو ہوا میں پر سمیٹے رہ گیا

اک تھکا ہارا مسافر سوچتا ہے دیر سے
ساحلِ اُمید پر گھر بنتے بنتے رہ گیا

روشنی کا ایک ہالہ دے گیا دھوکا مجھے
تیرگی جب بڑھ گئی وہ بھی کنارے رہ گیا

جڑ پکڑ کر رہ گیا آنکھوں میں کربِ انتظار
بے کراں تاریکیوں میں تارے گنتے رہ گیا

رہ گئی تھی جب کسر اک آنچ کی خود میں فرید
ارتباطِ بے سبب باقی یہ کیسے رہ گیا





خواہشوں کے تسلسل میں زنجیر ہوں
رُک نہ میرے لئے وقتِ تاخیر ہوں

گم ہوئی بھیڑ میں میری پہچان تک
بے جہت لفظ ہوں حرفِ تنکیر ہوں

ماحصل غیر کا میری کھیتوں کی فصل
اک علاقہ ہوں غاصب کی جاگیر ہوں

بے ثمر کوششوں کا یہ حاصل ملا
خواہشیں ترک کیں تن بہ تقدیر ہوں

صبح مسلیں گی سورج کی کرنیں مجھے
تیرگی میں ایک آوارہ تنویر ہوں

میرا مقسوم حیرت بھی وحشت بھی ہے
میں کہ دیوار پر ایک تصویر ہوں

خوفِ نادر میں بھی جی رہا ہوں فریدؔ
اس زمانے کا میں حاتمؔ و میرؔ ہوں



چاند کی پہلی کرن پوچھنے آتی ہے حال
جب یہاں کوئی نہیں ہوتا ہے تب پوچھتی ہے

اس طرح پہلے کبھی بام نہ در سجتا تھا
آج کیا بات ہے یہ رونقِ شب پوچھتی ہے

پہلے پوچھا ہی نہیں دل کے دھڑکنے کا سبب
کشتیاں ڈوب کے کیا موجِ غضب پوچھتی ہے

دل کی وسعت کے لئے چاند ستارے کم ہیں
اکتفا کس پہ کروں میری طلب پوچھتی ہے





پہلے پوچھا جو نہیں تھا وہی سب پوچھتی ہے
زندگی رات سے جینے کا سبب پوچھتی ہے

سایۂ تاک میں کتنی ہوئی کم تلخیٔ غم
اور کیا اِس کے سوا بنتِ عنب پوچھتی ہے

فہم و ادراک سے بالا ہے چلن دنیا کا
ہارنے والے سے یہ جیت کا ڈھب پوچھتی ہے

رنگ رخ، قربت جاں کچھ بھی نہیں پاس مگر
حاصلِ صحبتِ شب صبح طرب پوچھتی ہے

عشق میں عزتِ سادات گئی کیا اِس کا غم
دل کی نسبت نہ کبھی نام و نسب پوچھتی ہے

اسی لئے ہونٹ سی لئے تھے
سخن سخن بے ہراس تھا مَیں

تھا دھوپ صحرا کنارِ دریا
جہاں پہ کل بے لباس تھا میں

تھا آن واحد کا قرب لیکن
یہاں سراپا سپاس تھا مَیں

بنا ہوا تھا میں بے تکلف
چھپائے اندر کی پیاس تھا میں





بُجھے ہوئے دل کی آس تھا مَیں
وہاں بہ حدِّ قیاس تھا میں

غموں کے موسم گزر چکے تھے
نہ جانے پھر کیوں اُداس تھا مَیں

اِسی سبب سے میں جنگ جیتا
یہی کہ موقع شناس تھا مَیں

عجب طرح سے ہوا ہوں خالی
چھلکتی مے کا گلاس تھا میں

گھروں میں دھند آرہی تھی پیہم
اسی سبب بدحواس تھا مَیں



اس دل میں اُمنگ ڈالتا ہے
ڈل جھیل میں سنگ ڈالتا ہے

کتنا ہے عجیب دوست میرا!
ہر رنگ میں بھنگ ڈالتا ہے

آجا کہ صبا کے ساتھ موسم
ہر پھول میں رنگ ڈالتا ہے

کہتا ہے لو دیکھ زندگی کو
آندھی میں پتنگ ڈالتا ہے

وہ ریت کا گھر بنا رہا ہے
موجوں میں ترنگ ڈالتا ہے

زیرک ہوں بہت اسی لئے وہ
پانی میں نہنگ ڈالتا ہے

ساکت پڑی تھی جو مدّتوں سے
اس جھیل میں سنگ ڈالتا ہے





تجربہ میں کرتا ہوں خود کو اب بدلنے کا
کھیل کھیلنے بیٹھا آگ پر سے چلنے کا

پھک رہا ہوں اندر سے پر دھواں نہیں دیتا
کس سے میں نے سیکھا ہے یہ طریقہ جلنے کا؟

لگ رہے ہیں اب یکساں روز و شب کے ہنگامے
انتظار رہتا ہے اب نہ دن کے ڈھلنے کا

گاہ گاہ آئی ہے میری سمت کوئی موج
گاہ گاہ ملتا ہے حیلہ جی بہلنے کا

واقعہ نیا تھا وہ مجھ پہ کیا اثر کرتا
دل کہ بھول بیٹھا ہے طور اب مچلنے کا

دشتِ جاں میں چلتی ہیں آج پھر ہوائیں تیز
اب نہیں کوئی موقع زیست کے سنبھلنے کا





شکیب و صبر پہ میں انحصار کر نہ سکا
طریقِ غیر کبھی اختیار کر نہ سکا

یہ جانتا ہوں تغیّر ہے زندگی کی دلیل
میں اس لئے بھی ترا انتظار کر نہ سکا

مَیں سیرتوں کا ہمیشہ رہا ہوں شیدائی
مَیں صورتوں سے کسی وقت پیار کر نہ سکا

تمام عمر خریدے ہیں اور بیچے خواب
علاوہ اِس کے کوئی کاروبار کر نہ سکا

کچل کے چلتا ہے جذبات بے طرح سب کے
کسی بھی رشتے کو وہ استوار کر نہ سکا

وہ درمیان کی راہ اختیار کیا کرتا
جو امتیازِ یمین و یسار کر نہ سکا



بے چہرہ خواہشات کا بن کر ہدف رہے
ناکام اہلِ درد یہاں ہر طرف رہے

اپنی بڑائی لوگ جتانے کے واسطے
گردانتے میں محو صفاتِ سلف رہے

بے وقت آندھیوں پہ بھروسہ نہیں کوئی
ہر شاخ سے کہو کہ وہ خنجر بکف رہے

کتنے عجیب لوگ تھے شہرِ دروغ میں
اپنی صداقتوں پہ اُٹھاتے حلف رہے

شر کو بنا فساد کی ہم کہنے والے لوگ
کٹ کر ہر اک زمانے میں ہم ہر طرف رہے

ایسا تو ایک شخص نہیں میرے شہر میں
جس کو کہ اب ملالِ زوالِ شرف رہے

اپنی اصلیت کون پرکھتا یہاں فریدؔ
خلوت میں اس سبب سے مثالِ صدف رہے





شوق خوابیدہ وہ بیدار بھی کر دیتا ہے
ہوسِ زیست سے سرشار بھی کردیتا ہے

حسن بے داغ کی بس ایک جھلک دکھلا کر
واقفِ لذتِ تکرار بھی کر دیتا ہے

پہلے وہ ڈالتا ہے آگ کے دریاؤں میں
پھر اُسی آگ کو گلزار بھی کر دیتا ہے

رات بھر کرتا ہے وہ دن کے نکلنے کی دعا
صبح دم روشنی مسمار بھی کردیتا ہے

قصہء عفو گزارش کے تسلسل کے لئے
بے خطاؤں کو خطا کار بھی کر دیتا ہے

گلے لگائے گا وہ شخص کیسے غیروں کو
کبھی جو اپنوں پہ بھی اعتبار کر نہ سکا

مرا ضمیر گوارا نہ کر سکا اِس کو
تو یہ خیال نہ کر تجھ پہ وار کر نہ سکا

گھروں کی دورویاں کم کر گیا ضرور مگر
دلوں کی دوریاں کم نے سوار کر نہ سکا

تھا ابتداء سے فریدؔ انتہاء پسند مزاج
وہ اعتدال کو اپنا شعار کر نہ سکا





چہرہ پردے سے جو اس رشکِ قمر کا نکلا
ہر کوئی کہنے لگا چاند کدھر کا نکلا

میں یہ سمجھتا تھا گل و باغ و شجر اُس کے ہیں
وہ بھی محتاج مگر شاخِ ثمر کا نکلا

جل بجھا ہوں میں خس وخارِ ہوس کے ہاتھوں
شائبہ دل میں مرے رقصِ شرر کا نکلا

میری راتوں کو ستاروں سے سجانے والا
ڈھونڈے آج پتہ وقتِ سحر کا نکلا

سنگ بستہ میں حقائق سے لڑا کرتا ہوں
ایک ارماں نہ ابھی دیدۂ تر کا نکلا

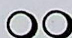
خود ہی رکھتا ہے دیئے تیز ہوا کی زد پر
اور آندھی سے خبر دار بھی کردیتا ہے

کبھی سکھلاتا ہے وہ صلح وصفائی کے ہنر
کبھی خود بر سر پیکار بھی کر دیتا ہے

کبھی کرتا ہے نچھاور مری راہوں میں پھول
وقت مل جائے تو پُرخار بھی کر دیتا ہے

انکساری کے سبھی راز بتا کر مجھ کو
یک بیک مائلِ پندار بھی کر دیتا ہے

پہلے کرتا ہے وہ آمادہ گناہوں پہ فریدؔ
پھر اس اک بات کا اظہار بھی کردیتا ہے





روز دکھلاتا ہوں میں زخم نہاں ایک نیا
مشغلہ ہاتھ لگا عمرِ رواں ایک نیا

شوق تھا کہہ کے اُسے حال، کروں دل ہلکا
لوٹ آیا ہوں لئے بارِ گراں ایک نیا

لکھ گیا کون مرے گھر کے یہ دروازے پر
خانہ ویراں نے بنایا ہے مکاں ایک نیا

خوف آتا ہے مجھے ایسے سبک لمحے پر
رنگ دکھلائے گی جب بادِ خزاں ایک نیا

روز آتا ہوں پلٹ کر میں لئے ٹوٹے خواب
روز کرتا ہوں مگر کارِ زیاں ایک نیا

ریت کے گھر وہ بناتا ہے یہاں اب اکثر
جو کہ قائل کبھی دیوار نہ در کا نکلا

جھیل کا ایک کنول پاس بلاتا ہے مجھے
اب کے شاید کوئی ارمان نظر کا نکلا

تھا نہ معلوم یہ، طوفانی ہے یادوں کا سفر
سر پھری موج کا رشتہ بھی بھنور سے نکلا

نیند میں رکھ گیا آنکھوں پہ کوئی اپنا ہاتھ
پاسباں کوئی تو اس اُجڑے نگر کا نکلا

جتنے واجب تھے کیے سارے ادا میں نے فریدؔ
پھر بھی باقی مگر اک قرض ہنر کا نکلا



تری طلب نے مجھے زندگی کے بارے میں
کئی سوال کیے اور میں لاجواب رہا





عجب طرح سے ہوں حیراں ہے رنگ عالی کیا
عطا کیا ہے تجھے حسنِ بے مثالی کیا

بکھرتے لمحوں نے کارِ عجب یہ کر ڈالا
مرے بدن کی صراحی کو رات خالی کیا

اسی سے ہوتا ہے اکثر گمان ہونے کا
اُفق پہ بجھ کے رہے گی کبھی یہ لالی کیا

تمہاری یاد جو آئی تو خود کو بھول گیا
اسی کو کہتے ہیں اے دوست بے خیالی کیا

وصال و ہجر ہیں الفت میں لازم و ملزوم
مگر ہے اِن میں کوئی لمحہ لازوالی کیا

اُس کو معلوم ہے میرا ہے بدن زخموں سے چور
مانگتا ہے وہ مگر تیر کماں ایک نیا

دور لگتا ہے مجھے پاس کا ہر اک منظر
پھیلتا جاتا ہے یہ کیسا دھواں ایک نیا

جن درختوں کے تلے مل کے کبھی بچھڑے تھے ہم
اب وہاں ہونے لگا عشق جواں ایک نیا

وہ غزل ہو کہ رباعی ہو دیا تو نے فریدؔ
ایک اک صنف کو اندازِ بیاں ایک نیا





ربط پیدا اِس قدر اُس یار جانی سے ہوا
وہ خفا مجھ سے میں اپنی زندگانی سے ہوا

اپنے دشمن سے زیادہ جانتا ہوں داوٴ پیچ
یہ ہویدا مجھ پہ اپنی کامرانی سے ہوا

غیر کی چاہت ہوئی ہے اس کے دل میں جاگزیں
مجھ کو اندازہ یہ اُس کی قصہ خوانی سے ہوا

داستاں در داستاں کردار یکساں ہوگئے
منکشف مجھ پر یہ اُس کی ظلم رانی سے ہوا

آڑی ترچھی سب لکیریں کھیل ہیں اُس ہاتھ کے
جو ہوا اب تک وہ اُس کی مہربانی سے ہوا

پاس میرے جو بھی ہے اُس کی نظر میں آگیا
فائدہ اتنا تو اس کی پاسبانی سے ہوا

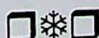
ہر ایک شاخ میں دوڑایا جس نے تازہ لہو
اسی ہوا کو کہوں وجہٗ پامالی کیا

اُدھار لیتا ہے جو روشنی چراغوں سں
اُسی کے در پہ میں' سورج رہوں سوالی کیا

مرے وجود کا ہر رنگ پڑ گیا پھیکا
سو اِس کے بعد ہے اب رنگ احتمالی کیا

مری طرف کوئی سروِ رواں سا آتا ہے
طرارے بھرتا ہے کیوں آنکھ ہے غزالی کیا

زباں ہے صاف خیالات بھی شگفتہ ہیں
فریدؔ تو نے یہ طرزِ سخن نکالی کیا





شاخ سے پھوٹ کے ہر گل کی تمنا ہو جاؤں
اب اِسی سوچ میں ہوں اِس کے سوا کیا ہو جاؤں

میری آواز پہ آواز کوئی دیتا ہے
سوچتا دیر سے ہوں کیسے شناسا ہو جاؤں

شہد کا گھونٹ ہوں چکھنے پہ مزا دیتا ہے
کڑوے ہونٹوں کے لئے کیسے گوارا ہو جاؤں

جانے کس سوچ میں بیٹھی ہے ستاروں کی قطار
چاندنی دیر سے کہتی ہے سراپا ہو جاؤں

جانے کس سمت لئے جاتا ہے خوابوں کا بھنور
دائرہ دائرہ ہر موج سے پیدا ہو جاؤں

لے کے نکلا ہوں میں پھر سوختہ خوابوں کا جلوس
خود تماشائی بنوں خود ہی تماشا ہو جاؤں



آسماں کی وسعتوں کو ناپنے کا شوق تھا
میں گرفتارِ بلا اس بے کرانی سے ہوا

پیچ کھانے آپ اپنے کو یہاں نکلے ہیں لوگ
میں بھی شامل ان میں اپنی خوش گمانی سے ہوا

آ گیا وہ سب سڑک پر گھر میں جو موجود تھا
کس قدر میں معتبر اِس آگ پانی سے ہوا

بولتی روحِ غنیؔ ہے تیرے شعروں میں فریدؔ
یہ ہمیں اندازہ تیری خوش بیانی سے ہوا



شاعرِ رنگیں نوا طاہر غنی
فقرِ او باطن غنی ظاہر غنی

اقبالؔ



تری جِلو میں یہ شب بھی گزارنے جاؤں
پھر آج اپنا مقدر سنوارنے جاؤں

سراغ ہوش و خرد کا کہیں نہیں ملتا
تری گلی میں اُنہیں بھی پکارنے جاؤں

دل وجگر میں اُترتی ہے کہکشاں کی قطار
یہ چاند رات کہاں اب گزارنے جاؤں

مرے بدن سے کوئی چھینتا ہے سایہ مرا
چلو یہ بوجھ بھی سر سے اُتارنے جاؤں

وہ جیت کر بھی نہ کہہ پائیں جس کو اپنی جیت
اس اک طریقے سے بازی میں ہارنے جاؤں



بھاتا ہے مجھ کو چاند نظارہ سرِ فلک
ہر پھر کے آرہا ہوں دوبارا سرِ فلک

نکلا تھا گھر سے ڈھونڈنے میں اپنے آپ کو
آیا نظر نہ کوئی ستارا سرِ فلک

کرتے ہیں خواہشوں کا ہماری وہ احتساب
کہتے ہیں کہئے کیا ہے تمہارا سرِ فلک

جانے لگا ہے میرا دھواں ساحلوں کی سمت
شاید نہ کرسکا ہے گوارا سرِ فلک

خشک خانۂ وجود بھی اب خشک ہوگیا
خائف سا کر رہا ہے شرارا سرِ فلک

چل اس طرح سے دوریوں کو کم کریں فریدؔ
دیکھیں گے کیا بچا ہے ہمارا سرِ فلک





آشوبِ آگہی سے کنارا نہیں کیا
اِک بار کر چکا ہوں ' دوبارہ نہیں کیا

خود سے کبھی بچھڑنے نہ آپ اپنے کو دیا
اس طرح ہم نے اپنا خسارا نہیں کیا

ہوں سطح بیں ہمیشہ رہا منتظر میں قید
لیکن کسی کو آنکھ کا تارا نہیں کیا

آسائشِ بدن نہ میسر کہیں ہوئی
سایوں نے کوئی کام ہمارا نہیں کیا

اُن منظروں کو دیکھنے کی تاب ہی نہ تھی
ایسا نہیں کہ میں نے نظارا نہیں کیا

میں ایک ہو کے بٹا ہوں ہزار خانوں میں
میں اپنی اصل کہاں پر نکھارنے جاؤں

اس ایک شب کہ سہارا ہے تیری یادوں کا
اس اک خیال میں یہ سب گزارنے جاؤں

ہزار چھید دیئے جس کو اہل دنیا نے
میں کس کے آگے وہ دامن پسارنے جاؤں





کر رہے ہیں آپ اپنی جستجو مَیں اور ہَوا
ایک جا ہو جائیں گے شاید کبھو مَیں اور ہَوا

آئے گی فرصت میّسر دونوں کو شاید کبھی
کر ہی لیں گے دیر تک پھر گفتگو، میں اور ہوا

بھر گئی ہے دھند ذہنوں میں دیارِ غیر کی
بے سبب پھرتے نہیں ہیں کو بکو ، میں اور ہوا

ایک سا رہتا ہمیشہ ہی نہیں اپنا مزاج
ہیں ملائم اور کبھی ہیں تند خو ، مَیں اور ہَوا

کیا بتاؤں کس طرح سینچا ہے ہم نے ہر شجر
پیش اکثر کر گئے اپنا لہو ، مَیں اور ہَوا

اتنا میں جانتا ہوں بہت ہی اُداس ہوں
پر بے دلی سے میں نے اشارا نہیں کیا

پنپا نہ کوئی خواب ہی بنجر نگاہ میں
یہ کیا کہ تیرا ساتھ گوارا نہیں کیا

تکمیل کی خلش ہے مرے دل میں موجزن
اس مرحلے میں تجھ کو سہارا نہیں کیا

لڑنا ہی اپنے آپ سے مصرف ٹھہر گیا
میں نے پرائے غم پہ گذارا نہیں کیا





خود سے نہیں مانوس ہوں ، حیران ہوں
ملتا کفِ افسوس ہوں ، حیران ہوں

لگتا تھا کل خوش بخت ہوں بے انتہا
پر آج میں مایوس ہوں ، حیران ہوں

تیرہ شبی نے آ لیا میرا وجود
بے شمع کا فانوس ہوں، حیران ہوں

وہم ویقیں یکساں ہیں میرے لئے
خوابوں کا میں ، ملبوس ہوں حیران ہوں

مل کر بچھڑ جاتے نہیں لوگ اِس طرح
میں طائع منکوس ہوں حیران ہوں

جابجا سرگوشیاں کرنے لگیں پرچھائیاں
گھر سے باہر جب کبھی نکلے ہیں، تو مَیں اور ہَوا

دل لرز اٹھتا ہے اکثر اس گماں پر بے طرح
پیش ہو جائیں گے اک دن رو برو مَیں اور ہَوا

بے خبر اپنے سے ہو کر لائیں گے اپنی خبر
اس طرح سے طے کریں گے دشتِ ہو مَیں اور ہَوا

بانٹ کر آپس میں کوچے اور گلیاں، شہر کی
توڑ دیں گے نفرتوں کا ہر سبو، مَیں اور ہَوا

سوچتا ہوں دیر سے لا حاصلی کے دشتِ میں
کر گئے ہر خواب کیوں نذرِ نمو، مَیں اور ہوا

انفرادی سوچ آخر کر گئی تنہا فریدؔ
ہو گئے بیگانۂ ہر رنگ و بو مَیں، اور ہَوا





دے رہا تھا کوئی رہ رہ کے صدا یاد آیا
رات چلتی تھی بہت تیز ہوا یاد آیا

اسی رستے پہ کبھی میں نے جلائے تھے چراغ
اِسی رستے پہ کبھی مَیں تھا کھڑا یاد آیا

اس کے کاندھے پہ پرانی سی پھٹی چادر تھی
دے گیا تھا وہی جینے کی دعا یاد آیا

لوگ شیشے کے تھے گھر شیشے کے سڑکیں شیشہ
خواب میں دیکھی تھی اک ایسی جگہ یاد آیا

رکھ گیا چاند ستارے وہ سبھی اپنے پاس
دے گیا تھا مجھے ماٹی کا دِیا یاد آیا

چاندنی رات تھی تارے تھے کوئی کہتا تھا
اس طرح مجھ کو مجھی سے نہ چرا یاد آیا

آپ اپنے کو خود حوصلہ دیتا ہوں میں
منزل کہ میں ناقوس ہوں حیران ہوں

اس خشک سالی پر بھی میں ہوں مطمئن
کس رُت کا یہ طاؤس ہوں، حیران ہوں

کہتی رہی مجھ کو ہوا چل ساتھ چل
میں نے کہا محبوس ہوں ، حیران ہوں

ہر کام خود میں نے بگاڑا بے طرح
اپنے لئے منحوس ہوں حیران ہوں





مَیں خوابوں کی شمعیں جلاؤں گا اک دن
زمیں پر ستاروں کو لاؤں گا اِک دن

مرے سورجوں کو ڈراتے ہو جس سے
وہ ہے ایک تارا دکھاؤں گا اِک دن

بجھاتا ہے میرے دیئوں کو جو اکثر
میں اُس کے دیئے بھی بجھاؤں گا اِک دن

جدا کر رہی ہے مجھی کو جو مجھ سے
وہ دیوار بھی میں ہٹاؤں گا اک دن

یقیں ہے ملے گا وہ کھویا ہوا پل
ہر اِک راستے کو سجاؤں گا اِک دن

قطعہ

اُس نے اُس رات نہ توڑی تھی خموشی اپنی
وہ فقط سنتا رہا میرا گلہ یاد آیا

اُس نے بھی چھوڑی نہ تھی کوئی نشانی اپنی
میں نے بھی پوچھا نہ تھا پورا پتہ یاد آیا

رات پھر ڈھونڈنے نکلا تھا پتہ اپنوں کا
صبح پھر تھک کے میں گھر لوٹ گیا یاد آیا

کرنے آیا تھا کوئی خوابوں کو سب میرے مسمار
اس لئے رات یہاں شور مچا یاد آیا





ہوں تصنّعات پہ ملتفتِ نہ زیادہ چھان پھٹک مجھے
کہ خیال و خواب کی منزلوں سے گزرنے کی ہے للک مجھے

یہ طلسم ذات میں چھوڑ کر مرا میں کدھر کو چلا گیا
کہ میں اپنے آپ سے مل سکوں ہے تلاش آج تلک مجھے

وہی شاخ بیٹھا ہوں کاٹنے تھا بسیرا جس پہ کبھی مرا
مری خواہشوں کا یہ اک فسوں ہی زمیں پہ دے گا پٹک مجھے

جو میں ہوں تو پھر یہ ہَوا نہیں کی کہاں سے آتی ہے پے بہ پے
مرے ہونے پر یہی سلسلہ ہی کرا نہ دے کہیں شک مجھے

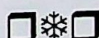
میں اُبھارتا گیا چاک پر کوئی شکل اپنے گمان سے
اِسی دُھن میں اپنی شکست کی نظر آئی ایک جھلک مجھے

مرے ساتھ ساتھ چلا مگر ہوا آخرش وہ طویل تر
مری صحبتوں میں پلا بڑا وہی دے گیا ہے کسک مجھے

میری فصل کیوں غیر کی ملکیت ہے
یہ باتیں سبھی میں بتاؤں گا اِک دن

مجھے بانٹتا ہے جو خانوں میں اکثر
بھرم توڑنے اُس کا آؤں گا اک دن

نہیں دور ہے خواب سے کیوں حقیقت
میں تفصیل اِس کی سناؤں گا اِک دن





ہر گھنے سائے کو بے نام ونشاں کرتا ہوا
وقت گزرا خواب میرے رائیگاں کرتا ہوا

کون آتا ہے مری راتوں کو کرنے معتبر
کون جاتا ہے مری شمعیں دھواں کرتا ہوا

اُس نے ہنستے کھیلتے پھاندی ہے دیوارِ یقیں
میں کہ خود کو پھر رہا ہوں خوش گماں کرتا ہوا

کیا بتاؤں کس طرح پیش آئی مجھ سے زندگی
سو نہ جاؤں میں یہی قصہ بیاں کرتا ہوا

میری بستی سے ہے گزرا ایک لشکر اِس طرح
دودھ پیتے بچوں پر مشقِ سناں کرتا ہوا

انہی راستوں پہ کرے گا دِق عجب ایک باسی معاملہ
انہی راستوں پہ ہی دے گیا تھا ترا خلوص مہک مجھے

وہ جو مستعار تھیں رونقیں نہ زیادہ دُور وہ جا سکیں
جو رمق تھی اپنے وجود کی وہی دے رہی ہے چمک مجھے

میں اسیر شوق ثبات ہوں میں فقیر ذوق دوام ہوں
کبھی خیرہ کر کے دکھائے گی یہ زمانہ بھر کی دِمک مجھے

یہ طلسمِ ذات ہے مہرباں یہی کر نہ دے کہیں بے اماں
میں فرید تیرا ہوں جانِ جاں یونہی حیرتوں سے نہ تک مجھے





تسلسل ٹوٹتے خوابوں میں پیدا کر گئی دُنیا
نئے انداز سے شعلے نظر میں بھر گئی دُنیا

مری عجلت پسندی نے ہی ہر دم رُخ بدل ڈالا
اسی رستے پہ میرے ساتھ میں اکثر گئی دُنیا

خمیدہ پشت پر اِک لاش لے کر اپنے ہونے کی
کوئی پہچان کب پایا یہاں گھر گھر گئی دُنیا

نظر انداز کرتا ہوں میں دُنیا کارِ دُنیا بھی
یہ کیوں اپنا بنانے کا تقاضہ کر گئی دُنیا

تمہارے بعد اب کھُبتا نہیں ہے کوئی نظروں میں
چلو اتنا تو اچھا کام آخر کر گئی دُنیا

مجھے دنیا کی فکروں سے کیا آزاد اپنوں نے
یہ کس انداز سے دیکھو کُتر کر پَر گئی دنیا

مرا ہونا نہ ہونا ایک سا ہے اُس کی نظروں میں
سلیقے سے الگ کر کے ہر اک منظر گئی دُنیا



سہہ رہا ہوں دیر سے لاسمتیت کا اک عذاب
کٹ گیا اپنوں سے خود کو آسماں کرتا ہوا

کھو گئے گاڑھے دھویں میں شہر کے منظر تمام
اک پرندہ رہ گیا آہ وفغاں کرتا ہوا

کس نے رکھی ہے مری آنکھوں میں خوابوں کی قطار
کون خواہش دل کی جاتا ہے جواں کرتا ہوا



وہ ایک بات جو باعث ہوئی تعلّق کی
اُس ایک بات کا کرنا اعادہ تھا پہلے

محبتوں کے دیئے میں جلا کے سو جاؤں
مرا خیال نہیں یہ ارادہ تھا پہلے

فریدؔ کرتا تعیّن میں کیسے راستے کا
نہ منزلیں تھیں یہاں اور نہ جادہ تھا پہلے





ترے بغیر بھی جی لوں ارادہ تھا پہلے
ذرا یہ سوچ کہ میں کتنا سادہ تھا پہلے

اسی زمیں نے دیئے جور کے جلائے بہت
اِسی زمیں سے تعلّق زیادہ تھا پہلے

وہیں پہ اب بھی کھڑا ہوں میں ساکت وجامد
جس ایک راہ پہ میں ایستادہ تھا پہلے

اسی مکاں میں گھٹن ہو رہی ہے اب محسوس
یہی مکان بہت ہی کشادہ تھا پہلے

چمک دمک وہ مری اپنے ساتھ لے کے گیا
چمکتا جسم دمکتا لبادہ تھا پہلے



چلچلاتی دھوپ میں عریاں ہے تن
کون دیکھے گا بھلا اب حالِ من

کیوں نہ وہ ہر معرکے کو سر کرے
جس کا پشتیبان ہے خیبرؑ شکن

بے ستوں کو کاٹنے بیٹھا ہوں میں
آئے گی سمجھانے کوئی پیر زن

جی رہا ہوں سنگ بستہ دور میں
دے رہا ہوں اپنے خوابوں کو کفن

ڈھونڈنے نکلا ہوں اپنے آپ کو
کوئی کہتا تھا مجھے اپنا تو بن



حسن اِمکاں، رنگِ رخ، رنگِ بدن زد پر رہا
کیا بتاؤں میں تجھے کیا کیا سجن زد پر رہا

میں تو کیا میری اَنا بھی داؤ پر رکھی گئی
ساتھ میرے اب کے میرا بانکپن زد پر رہا

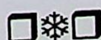
عقل والوں پر وہاں کھلتے ہیں از خود راستے
جس گلی میں اک مرا دیوانہ پن زد پر رہا

ہر سخن کو تولتا ہوں بولتا ہوں منہ سے پھر
پھر بھی جانے کیوں مرا ذوقِ سخن زد پر رہا

ہو رہی ہے اس طرح تجدید ہر اِک خواب کی
جو بچا تھا آنکھ میں عکسِ کہن زد پر رہا

عشق پر لگنے لگی ہیں تہمتوں پر تہمتیں
حسن بے پروا سے چاکِ پیرہن زد پر رہا

کل تلک مہکا رہی تھی جس کی خوشبو چار سُو
اک شکارِ کینہ ور کی، وہ ہرن زد پر رہا





ملن کی شمع جلا دور ہر شکایت کر
فسردہ دل ہوں میں پوری مری ضرورت کر

وہ بات کرنے لگا مجھ سے میرے لہجے میں
گھما پھرا کے یہ کہتا ہے اب محبّت کر

کوئی ہے جس نے یہاں ہار ہی نہیں مانی
کہانی میری سنا اور محوِ حیرت کر

سکھا رہا ہے ہنر نفیٔ ذات کا مجھ کو
وہ ایک شخص جو کہتا تھا کل بغاوت کر

یہ موڑ کاٹ کے پھر زندگی سے ملنا ہے
اس ایک بات پہ آمادہ اب طبیعت کر

بن گیا ہوں اب بہت باریک میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں خوشبو کا وطن

ایک سا لگتا ہے مجھ کو ہر دیار
کاشمر ہو وہ کہ دلّی یا دکن

مل سکیں گے کس طرح دونوں فریدؔ
اُن میں شوخی اور مجھ میں بانکپن



تازہ ہوائیں مانگی تھیں
لوُ کے جھونکے ملے سوغات





مرے چراغ کو طاقِ زیاں پہ رکھتا ہے
جہاں اندھیرا نہیں ہے وہاں پہ رکھتا ہے

میں نیم جان رہوں یا کہ جاں گُسل اُسے کیا
یہ انحصار وہ تیر و کماں پہ رکھتا ہے

جنوں کے کام کو وہ کارِ سہل کہتا ہے
عجب گمان وہ کارِ جہاں پہ رکھتا ہے

ہوا کے ہاتھ میں دے کر گیا وہ میرا ہاتھ
وہ اس طرح بھی مجھے امتحاں پہ رکھتا ہے

ہر ایک ہاتھ میں پتّھر تھما دیا اُس نے
یہ کیا گمان وہ شیشہ گراں پہ رکھتا ہے

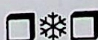
مرے چراغ کو دوشِ ہوا پہ رکھ کے نہ جا
نہ اس طرح مری محنت کو اب اکارت کر

غموں کا بوجھ وہی رکھ رہا ہے شانوں پر
جو کل تلک مجھے کہتا تھا عیش وعشرت کر

یہ کون مجھ سے خفا ہو رہا ہے میری طرح
اسے تو سایہ سمجھ وہم سے عبارت کر

یہاں پہ چاند ستارے ہیں گردشوں کے اسیر
کوئی نہ تیرا بنے گا ہزار محنت کر

خموش رہنا یہاں پر ہے بزدلی کی دلیل
ستم گری کو ذرا موردِ شکایت کر





اِک بہانہ ملے اور خود سے تعلّق بڑ جائے
کاش ایسا ہو کہ یہ بیل بھی منڈوے چڑھ جائے

اپنے ماضی کی طرف مڑ کے نہیں دیکھتا ہوں
اس لئے بھی نہ کہیں درد و الم پھر بڑ جائے

ایک مدت سے نہیں ہوتا ہے احساسِ زیاں
کوئی موقع نہیں ملتا ہے کہ خود سے لڑ جائے

کرنے بیٹھا ہے کوئی میری زمیں کو تقسیم
اُس کی خواہش پہ خدایا کوئی پتھر پڑ جائے

ہو کے پنجوں پہ کھڑا مجھ سے ملا اپنا قد
عین ممکن ہے یونہی تیرا بھی قد کچھ بڑ جائے

اب دھواں دھار برس اتنا تو بادل سے کہہ
یہ نئی فصل ہے پکنے سے نہ پہلے سڑ جائے

یہ زمیں میں نے نکالی ہے نئی تازہ فریدؔ
اس لئے ڈر نہیں مصرع نہ کسی سے لڑ جائے



چرا کے رنگ وہ چہرے کا جسم مانگتا ہے
بہت سے قرضے مری نقدِ جاں پہ رکھتا ہے

بدلتا جاتا ہے وہ گام گام راہ اپنی
وہیں پہ مجھ کو ہے رُکنا جہاں پہ رکھتا ہے

یہی کہ چھوڑ گیا تنگنائے دنیا میں
وہی کہ اپنا مکاں لامکاں پہ رکھتا ہے

میں اُس کو بھول جاؤں تو کس طرح جو فریدؔ
بنائے قربِ غمِ جاوداں پہ رکھتا ہے



روز کہتا ہے صبح کو سورج
نکل آیا ہوں پھر زوال سے میں

میرا ماضی ہی شاندار رہا
مطمئن ہوں نہ اپنے حال میں میں

حلقہ حلقہ ہے جس کا کام نہنگ
نکل آیا ہوں ایسے جال سے میں

مجھ کو مجھ سے وہ مانگتا ہے فریدؔ
کیوں نہ خائف ہوں اس سوال سے میں





رنج و راحت کے انفصال سے مَیں
تنگ آیا ہوں اِس وبال سے مَیں

زیست میری سنور ہی جائے گی
جی رہا ہوں اسی خیال سے مَیں

پیش منظر بنے گا پس منظر
مطمئن ہوں اس احتمال سے میں

چند خاکوں میں بھر دیا ہے رنگ
خوش بہت ہوں اس اِک کمال سے میں

پھول پھل جس پہ لگ گئے تھے بہت
کٹ گیا ہوں اُس ایک ڈال سے میں



اور کیا اس کے سوا اہل نظر جانتے ہیں
پگڑیاں اپنی بچانے کے ہنر جانتے ہیں

اک ستارے کو ضیا بار دکھانے کے لئے
وہ بجھائیں گے سبھی شمس وقمر جانتے ہیں

اس طرح بھاگتے سایوں پہ نظر رہتی ہے
کام آتا ہے بہت روزنِ در جانتے ہیں

خواب میں دیکھتے ہیں کھڑکیاں ہر گھر کی کھلی
دور ہو جائے گا اب شہر سے ڈر جانتے ہیں

کسی جھولی میں یہ تارے نہیں گرنے والے
یہ طلب گار کا اندازِ نظر جانتے ہیں



پیکار زندگی میں ہے کارِ فغاں بند
جینا ہے گر قبول کر اپنی زباں بند

اس درجہ گھٹ گیا ہے مکینوں میں اعتماد
کرتے ہیں شام ہونے سے پہلے مکاں بند

رونق یہ میرے شہر کی اب لے گیا ہے کون
ایک اک سڑک خموش ہے ایک اک دوکان بند

گرہیں میں کھولنے لگا اپنے وجود کی
یاں سے جو کھولتا ہوں تو ہوتی ہیں واں بند

چھلنی ہوا ہے جسم مرا پھر بھی دیکھنا
کرتے نہیں ہیں مشق وہ تیر و کماں بند

کن حادثوں کو دیکھ کر سکتے میں آئے لوگ
حیران ہر نگاہ ہے اور ہر زباں بند

جاتا ہوں پھر فریدؔ درِ شیخ حمزہؒ پر
بابِ قبول رہتا نہیں ہے وہاں بند





پرانی روشنیوں کو بجھائے دیتا ہوں
نئے ستارے زمیں پر مَیں لائے دیتا ہوں

عجیب حال پریشاں ہوں دیکھ لو مجھ کو
کوئی سنے نہ سنے میں بتائے دیتا ہوں

مرے وجود کی لو تھرتھرانے لگتی ہے
یہ کن ہواؤں سے خود کو ڈرائے دیتا ہوں

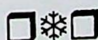
کبھی کبھی سبھی خوابوں کو رہن کرتا ہوں
کبھی کبھی سبھی قرضے چکائے دیتا ہوں

گرے اگر مری دستار وہ ہے موت مری
یقیں کرو نہ کرو میں دکھائے دیتا ہوں

روشنی غیر کی ہوتی ہے چکاچوند بہت
ہم اسے کچھ بھی نہ جز رقصِ شرر جانتے ہیں

وہ جو سُستانے یہاں آئے ہیں اک دن صاحب
سائے کے ساتھ ہی مانگیں گے شجر جانتے ہیں

تیز آندھی سے دیئے سب کے بچانے کو فریدؔ
خود کو رکھے گا سرِراہ گزر جانتے ہیں





بے طرح خوابوں کا دیکھا مجھ کو عادی خوش ہوا
جب کھلی اُس پر مری خوش اعتقادی خوش ہوا

میں نے بھی ظاہر کیا اُس پر نہیں ہوں خود کفیل
دیکھ کر اَبکے وہ میری کم سوادی خوش ہوا

تن بدن میں آگ پھیلاتی ہے اُس کی بانسری
اپنا کرتب دیکھ کر آتش نہادی خوش ہوا

صف شکن بادِ مخالف سے نہ آیا ابکے خوف
بھانپ کر آپ اپنے میں خود اعتمادی خوش ہوا

کس طرح سائے میں سایہؔ ہوگیا گڈمڈ تھا رات
سارا قصہ سن کے یہ خالد عبادی خوش ہوا

کوئی تو ہے جو چرانے لگا مجھی سے مجھے
اس ایک وہم میں اب غل مچائے دیتا ہوں

بھرے درختوں کو یہ بیل کیسے ڈھانپتی ہے
چلو تمہیں بھی یہ قصہ سنائے دیتا ہوں

کوئی بتا کے گیا تھا پلٹ کے آؤں گا
اس اک اُمید میں شمعیں جلائے دیتا ہوں





خوابوں کا اک ہجوم شکیبائی لے گیا
چھوڑا مجھے مگر مری تنہائی لے گیا

پہچان اپنے آپ کو پاؤں میں کس طرح
یہ دور مجھ سے میری شناسائی لے گیا

شاید کہ ایک نیزے پر آیا ہے آفتاب
یا کوئی میرے جسم سے پرچھائیں لے گیا

مٹی کی سب امانتیں مٹی کو سونپ دی
اک گھر بچا تھا وہ بھی مرا بھائی لے گیا

میں کر رہا ہوں کل سے اشاروں میں گفتگو
یہ کون مجھ سے قوتِ گویائی لے گیا

وسعت سڑک میں دے کے وہ رونق بڑھا گیا
لیکن مرے مکان کی انگنائی لے گیا



میں حدوں کو توڑتا ہوں خود کو پانے کے لئے
وہ سمجھ کر سوچ اِس کو انفرادی خوش ہوا

اک ذرا بھاتی نہیں ہیں اُس کو رنگ آمیزیاں
دیکھ کر میری طبیعت بھی وہ سادی خوش ہوا

لگ گیا امرت کے بدلے وِش پلانے پھر فریدؔ
دیکھ کر اس بات کا مجھ کو وہ عادی خوش ہوا





ہے خبر اس کی اُسے بھی، نہیں شاید بھی نہیں
یاد آتا ہے وہ اتنا کہ کوئی حد بھی نہیں

آنکتا رہتا ہوں میں بھاگتے سائے دن بھر
کام کرتا ہوں وہ جس کا کوئی مقصد بھی نہیں

کیسے اپنائے گا یہ وقت کا دربار مجھے
جب مرے پاس کوئی حرفِ خوشامد بھی نہیں

اب کے انصاف طلب کرنے لگے شہر کے لوگ
جب کہ آئین میں ایسی تو کوئی مد بھی نہیں

مرگیا وہ بھی ہے بے نام زمیں کی خاطر
اس لئے اُس کے نصیب اب کہیں مرقد بھی نہیں

جانے کیوں ناپتا رہتا ہے وہ سایہ اپنا
کیسے کہہ دوں اُسے سایوں کا کوئی قد بھی نہیں

کیوں مرا ساتھ نبھاتا نہیں یہ ماہِ تمام
میں کہ آزاد بھی ہوں وہ کہ مقیّد بھی نہیں

اُس سے کرتا ہوں مروّت کی توقع میں فریدؔ
جس کی فرہنگ میں یہ حرفِ مشدّد بھی نہیں





یہ زیست کرنے کی نکلی سبیل راتوں رات
میں خود سے ہونے لگا ہوں طویل راتوں رات
وہ میری روح کو پھر بھی نہ کر سکا آزاد
جو ڈھا کے نکلا بدن کی فصیل راتوں رات
دیا ہے جاگتے تاروں نے بے مہار سا کرب
بنا گئے ہیں مجھے خودکفیل راتوں رات
میں بار بار یہاں زد پہ چڑھتا رہتا ہوں
چڑھائی کرتے ہیں اصحابِ فیل راتوں رات
سروں کو طشت میں لے کر سحر ہے آنے کی
یہاں سے بھاگ اے ابن السبیل راتوں رات
میں اپنے آپ کو جل باس کرنے والا تھا
مرے مکاں میں اُگا رودِ نیل راتوں رات
طیور ناچتے تھے جس کی شاخ شاخ پہ کل
برہنہ ہوگئے وہ سب نخیل راتوں رات
فریدؔ بھول گیا اپنا لب ولہجہ بھی
وہ شعر کہنے لگا ہے ثقیل راتوں رات





یہ کون آیا ہے میرے قریب آخر شب
بنا رہا ہے مجھے خوش نصیب آخر شب

ہوئے ہیں چاند ستاروں کے ساتھ خواب ہَوا
میں ہو گیا ہوں بہت ہی غریب آخر شب

حریف ایک طرف ہے غنیم ایک طرف
مجھی میں پڑنے لگا رَن عجیب آخرِ شب

حساب لینے لگا خود سے اوّلِ شب کا
میں بن رہا ہوں خود اپنا حسیب آخر شب

خموش بیٹھا تھا جو شاخِ دل پہ شام سے ہی
چہک رہا ہے وہی عندلیب آخرِ شب

یہ کون مانگ رہا ہے یہاں مجھی سے مجھے؟
میں بن رہا ہوں یہ کس کا نصیب آخرِ شب

شگفتہ لہجے میں ہم سے ہوا وہ محوِ کلام
یہاں تھا آیا فریدؔ الحبیب آخرِ شب





وسوسوں کے شہر میں اپنا مقدر دیکھ کر
مر رہا تِل تِل ہوں میں خوابوں کو بنجر دیکھ کر

شاید اپنے شہر میں دیکھا نہ تھا پہلے کبھی
جی اُمڈ آتا ہے کیوں میرا' یہ منظر دیکھ کر

وہ مرا ہمزاد ہے یا میرے خوابوں کا حریف
جو بدل لیتا ہے رستہ مجھ کو اکثر دیکھ کر

یہ نہیں سوچا کہاں جاتا ہوں جانا ہے کدھر
میں کہ ہمرہ ہولیا اک لاؤ لشکر دیکھ کر

میں نے ہی بخشی تھی اس کو قوتِ پرواز کل
آج جو خوش ہورہا ہے مجھ کو بے پَر دیکھ کر

وہ کہ استغناء تھا اپنا' یا کہ ناواقف تھے ہم
چونکتے ہیں سائے کو قد کے برابر دیکھ کر

خواہشوں میں آگیا ہے اعتدال اب اے فریدؔ
پاؤں پھیلانے لگا ہوں میں بھی چادر دیکھ کر



پھر پرائی آگ میں جلنے لگا میرا وجود
یہ دھواں پھیلے گا گھر گھر اس میں شک باقی نہیں

گھورتے ہیں لوگ کیوں پرچھائیوں کو اس طرح
شاید اُن کے پاس خوابوں کی جھلک باقی نہیں

حظ اُٹھا سکتے نہیں ثقلِ سماعت کے سبب
کہہ رہے ہیں پھر بھی باتوں میں نمک باقی نہیں

میں ہوا بے رنگ موسم کے سبب یا اب فریدؔ
قرب کے بے لوث لمحوں کی دھنک باقی نہیں





کیف زا لمحوں کی مجھ میں اب للک باقی نہیں
میں تو ہوں لیکن وہ پہلی سی کسک باقی نہیں

ایک مدت سے نہ رکھا میں نے پٹھے پر ہے ہات
کیا کوئی چکر بھی اب دورِ فلک باقی نہیں

رونق دنیا ہے باقی میں ہی لیکن بجھ گیا
چاند ہے بھرپور تارے میں چمک باقی نہیں

میں بھلا بیٹھا ہوں ہنستے بولتے لمحوں کی یاد
تجھ میں بھی شاید یہ قدرِ مشترک باقی نہیں

دل کا رشتہ یاد سے ٹوٹا ہے مدت ہوگئی
پھول باقی ہے مگر اس میں مہک باقی نہیں

آسودہ جسم و جاں ہوں کبھی شہرِ سنگ میں
وا اس اُمید پر نہ یہاں چشم ولب کریں

لہروں کے ساتھ آنے لگی ریت پے بہ پے
کب تک دراز ہم یونہی دستِ طلب کریں

دھندلا گیا ہے عزّ و شرف کا ہر ایک نقش
اب کس اُمید پر کوئی فکر نسب کریں





ہر خواب یاد رکھنے کا پیدا سبب کریں
جو آج تک نہ کر سکے وہ کام اب کریں

ہونے لگا یہاں پہ بلاؤں کا پھر نزول
اب کچھ نہ کر سکیں گے چلو ذکرِ رُب کریں

جگنو مثال خود کو جلائیں گے رات بھر
معمور اس طریقے سے یہ تیرہ شب کریں

ہم نے تو اس کا ساتھ نبھایا ہے دیر تک
اب اس سے دور جانے کا کارِ عجب کریں

سب جیت پر مناتے ہیں اکثر یہاں پہ جشن
ہم کیوں بپا نہ ہار پہ جشنِ طرب کریں

نظمیں



قدم قدم پہ دیئے شوق کے جلا کے چلے
ہمیں وہ لوگ ہیں جو اپنا سر اُٹھا کے چلے

نہ راس آئیں انہیں خوش گمانیاں میری
اسی لئے وہ یہاں آئینے سجا کے چلے

مَیں تیر کھاتا ہوں اور آہ بھی نہیں کرتا
وہ اِس طرح سے مرے حوصلے بڑھا کے چلے

وہی ہیں نوحہ کناں آج میرے ماتم میں
یہی ہیں کل جو مجھے کربلا میں لا کے چلے

کسی کے جور وستم یاد جو نہیں رکھتے
ہم اُن ہی لوگوں سے اب سلسلہ ملا کے چلے

جہاں پہ روز ہَوا سائیں سائیں کرتی ہے
اُس ایک دشت کا مجھ کو پتہ بتا کے چلے



نروان

ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے میرے چاروں طرف
میں کہ فریاد و فغاں کر کے ہی تھک ہار گیا

میں اکیلا ہر اک موج مخالف ہے مری
مجھ سے کترا کے مرا سایہ گزر جاتا ہے

میری آواز پہ غیروں کا گماں ہوتا ہے
کنڈیاں مار کے بیٹھے ہیں نحوست کے سانپ

خواب بھی میرے نہیں خواب کی تعبیر نہیں
ہاں مگر سوچ کے صحرا میں کوئی نخل اُمید

جس کے نم ناک شگوفوں نے نکھارا مجھ کو
پر شکستہ ہوں یہی سوچتا ہوں جس کے تلے

کوئی موسم یہاں آئے گا ضرور آئے گا
میرے کھوئے ہوئے بازو مجھے واپس کرنے



چلے بھی آوٴ کہ نغمہ بھی ہے نگار بھی ہے
گلاب و لالہ کے چہرے پہ کچھ نکھار بھی ہے
شجر حجر ہے معطر کلی کلی مدہوش
ہر ایک شاخ لئے جام انگبیں ہے کھڑی
روش روش ہے گلستاں قدم قدم ہے ختن

ملا و رنج کی باتیں بہت ہوئیں اب تک
چلو بدل کے چلیں اب کے گفتگو کے مزاج

نہ اِس کا ذکر کریں اب یہاں پہ کیا گزری
نہ اس کا ذکر کریں کٹ مرے ہیں کتنے جواں
نہ اس کا ذکر کریں دن ہیں چھوٹے رات بڑی
وطن ہے اپنا یقیناً مثال خلد بریں
کہیں نہ اس کا ہے ہمسر نہ اِس کا ثانی کہیں
چلی ہے جو رو جفا کی یہاں پہ ایسی ہوا

یقیں ہوگیا موہوم اور گماں مدقوق
سروں پہ کب سے مسلط ہے تیرگی کا غبار

شہرِ آشوب

ملال ورنج کی باتیں بہت ہوئیں اب تک
چلو بدل کے چلیں اب کے گفتگو کا مزاج
سوال کرتی ہوئیں ساعتوں سے بچ کے چلیں
جواب دیتے ہوئے راستوں سے لیں گے خراج
چلو چلیں گے کسی سیر گاہ کی جانب
جہاں پہ ہوگا میسر ہجومِ مہر وشاں
وہیں پہ بات کریں گے جلا کے شمع خیال
خلوص وشوق کا موسم سدا رہے گا جواں

بہار آئی ہر اِک شاخ ہے تر و تازہ
نمو پذیر ہے روئے حیات پر غازہ
چمن سے آیا ہے گلگشتگی کا اک فرمان
خیال وخواب کا موسم سدا رہے گا جواں

یہاں پہ کون کہے گا ٹھہر ٹھہر کے چل
میں کب کا بھول چکا دل نشیں ہر اک ساعت
وہ قربتوں کا درخشاں شفیق موسم بھی
رفاقتوں کا اُجالا خوشی کی رِم جھم بھی
ملال ورنج کی باتیں بہت ہوئیں اب تک
چلو بدل کے چلیں اب کے گفتگو کا مزاج

تری طرف جو کبھی غیر کی نظر اٹھتی
مری وفائیں اُسے نوچ کھانے کو مچلیں
ہوا ہے روزنِ ماہِ تمام بے رونق
رہا نہ یاد وہ چاہت کا بھیگتا موسم
رُکے تھے کتنے ہی لمحوں کو جاوداں کرلیں
چلے کہ عزم تھا دامن ترانہ چھوڑیں گے
مگر چلی ہے یہاں تیز تیز اک آندھی
اُجاڑ ہوگئے راستے محال ہوگئی زیست

شبہہ خواب نگاہوں میں لے کر پھرتا ہوں
کہیں نہ وقت کی آندھی اسے بھی گل کردے

متاعِ صبر وسکوں کے نشاں ہوئے دھندلے
سلاح وتیغ ہے کب سے نیام سے باہر
کہیں پہ اب نہ اُجالا اُداس ہے گھر گھر
برستے سنگ فلاخن سے گرچہ شام وپگاہ
فغاں کرنی یہاں جرم آہ بھرنی گناہ
"یہ اور بات ہمارے لہو کی پیاسی ہے
مگر زمینِ وطن پھر بھی ہے زمینِ وطن"

ملال و رنج کی باتیں بہت ہوئیں اب تک
چلو بدل کے چلیں اب کے گفتگو کا مزاج

نہ اِس کا ذکر کریں گے شقی ہیں اہلِ وطن
نہ اِس کا ذکر کریں گے کہ تنگ ہیں اوقات
زمانہ تارِ حریر دو رنگ کی مانند
زمانہ مرد تہی دست ' سنگ کی مانند
اس ایک بات پہ کیا زندگی حرام کریں

میں کب کا بھول چکا اپنے دستوں کا سلوک
میں کب کا بھول چکاہوں وفا کی راہ گزر

خبرِ تحیّر

تصوّرات کی پرچھائیوں میں جیتا ہوں
میں جینا چاہتاہوں پھر بھی زہر پیتاہوں
وہ خواب خواب گزر گہہ وہ دلنشیں موسم
جہاں سے کی تھی محبّت کی ابتداء ہم نے
قدم قدم پہ تمنائیں دم بہ خود میں یہاں
تلاش کرتاہوں کب سے وہ دلنشیں ساعت
وہ خوشبوؤں سے نکھرتا ہوا بدن اُس کا
میں واہموں میں گرفتار ہوگیا اِتنا
یہ سوچتا ہوں کوئی لمحہ جاوداں ہی نہیں

یہاں پہ مانگیئے کس سے سکون کی خیرات
یہاں کروں گا اب اپنے سوا میں کس سے بات
میں خود ہی آنکھ ہوں خود ہی قدم ہوں خود ہی ہات
ہر اک سوال کہ ریگ رواں کی مانند ہے
ہر ایک سلسلہ وہم وگماں کی مانند ہے





سمجھو کہ لگاؤ ہے فقط رٹ میری
پاؤ گے چہار سمت آہٹ میری
جب تجھ پہ کمالات کھلیں گے میرے
سجدوں سے سجادو گے چوکھٹ میری



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اگر غزل و ترانہ گوئی سہل و لطیف تر گوئی و بقوافی معروف گوئی

.... قابوس نامہ (امیر کیکاؤس)



چھٹنے کو ہے ابر کرم بسم اللہ
مٹنے کو ہے ہر کہنہ الم بسم اللہ
جذبات کی برف کو پگھلتے ہی بنی
پھر چلنے لگا میرا قلم بسم اللہ



انتساب

اہل وطن کے نام

مٹنا ہے عدُو کے سدّو حد کو اک دن
اِس گھات کو، دمدمہ کو، زد کو، اک دن
گھبرا نہ مسلط ہے جو اَشرم کی فوج
آئیں گے ابابیل مدد کو اک دن





پاکر میں یہاں کھوتا ہوں اکثر کیا کیا
خود کو دکھاتا ہوں مکرّر کیا کیا
پانے کا تجھے شغل ، تجسّس اپنا
پانی میں بہا دیتا ہوں دن بھر کیا



ہوں بود کہ نابود نہیں جانتا میں
کس آگ کا ہوں دود نہیں جانتا میں
جاں دے دی دیئے قلب وجگر بھی تجھ کو
نقصان ہے یا سود نہیں جانتا میں



پیدا ہے یہاں سبھی نہاں میں ہی ہوں
کس سے کہوں بے نام ونشاں میں ہی ہوں
مدت سے جو جلتی ہے نہ بجھتی ہے فریدؔ
اُس آتشِ ہستی کا دھواں میں ہی ہوں



موجود میں خود کو نہیں ڈھلنے دوں گا
سایوں کو میں سورج نہ نگلنے دوں گا
ہوں گردشِ ایام کہ لمحہ کوئی
اب آگے کسی کو نہ نکلنے دوں گا



للّٰہ اک انعام مجھے دیدینا
آرام سا آرام مجھے دیدینا
ہنگامہ طرب کا کہ غمِ مہجوری
خالی ہوں کوئی کام مجھے دیدینا



کٹتا ہی نہیں شام و سحر سے اپنے
ہٹتا ہی نہیں ہوں ابھی در سے اپنے
جنت سے نکالے گئے آدمؑ کی طرح
مجھ کو بھی نکالا گیا گھر سے اپنے



انگیز ہوئی میری طبیعت پوری
اب ہوگئی چکّی کی مشقّت پوری
سکھلا کے ہنر آگ وہ پینے کا مجھے
کر دی ہے مری بڑی ضرورت پوری



آئے گا فلک پر وہ ستارا واپس
یہ چیز ہے کیا آئے گا سارا واپس
افسوس اس اک بات کا ہے دنیا میں
آتا نہ مجھی کو ہے دوبارا واپس



نے وہم و یقیں کا مجھے رکھّا ہوتا
نے آں کا نہ ایں کا مجھے رکھّا ہوتا
آڑے آئی تری محبت ورنہ
جگ نے نہ کہیں کا مجھے رکھّا ہوتا



آ کر میں یہاں ہوا زیاں سنج بہت
ہوتا میں قریں اُس کے یہ تھا گنج بہت
ہوتا نہ اگر میں نہیں ہوتے غم بھی
دیتا ہے یہ ہونا ہی مجھے رنج بہت



سن! تہہ کی میں بات بتاتا بھی نہیں
پانی سے لگی آگ بجھاتا بھی نہیں
بے صوت و صدا ٹوٹتے جاتے ہیں خواب
اور میں ہو ذرا شور مچاتا بھی نہیں



چھوڑے ہوئے ہیں کارِ فغاں کون کہ میں!
ہے گاہ چنیں گاہ چناں کون کہ میں!
پکڑا ہے فقط صبر کا دامن کس نے
رکھتا ہے یہاں بند زباں کون کہ میں



دامن کو میں اشکوں سے بھگو لیتا ہوں
آہوں کی نئی فصل کو بو لیتا ہوں
وہ ریت کے گھر بنا کے خوش ہوجاتا
آتے ہیں وہ دن یاد تو رو لیتا ہوں



مندر کی کُنشت کی کہ ہو گھر کی آگ
خوراک ہی ہوتی ہے سمندر کی آگ
میں برف کے ماحول میں رہتا ہوں مگر
کم پڑتی نہیں ہے مرے اندر کی آگ



ہر موڑ پہ حاصل ہوئیں ماتیں اکثر
دیکھی ہیں فقط اپنوں کی گھاتیں اکثر
گہہ سردیٔ احباب گہے گرمیٔ غیر
کرتا ہوں یہی خود سے میں باتیں اکثر



ہر وقت صراحی یہ بھری رہتی ہے
شبنم سے ہر اک شاخ ہری رہتی ہے
کرلوں میں ستاروں کی تمنا کیونکر
سورج پہ نظر میری دھری رہتی ہے



حالات بدلنے کا ہے کم کم امکاں
بے حوصلہ طے ہوگا نہیں کچھ بھی یہاں
ہوں سہل پسند اُٹھے گا کیونکر صاحب
یہ بارِ گراں بارِ گراں بارِ گراں



وہ سیم بدن، مہر جبیں دیکھا ہے
میں نے اُسے بے وہم ویقیں دیکھا ہے
جلووَں کی وہ یورش کہ الٰہی توبہ
دیکھا بھی اسے اور نہیں دیکھا ہے



گاؤں کی ہے اور نہ ہے شہری ہَوا
آوارہ ہے من موجی ہے یہ لہری ہَوا
رُک جا کہ شجر میرے گریں گے سارے
مت کہہ کہ سنے گی نہیں کچھ بہری ہَوا



اندختہ خوابوں کا یہاں جلتا ہے
اندر مرے ایک وہم سا پلتا ہے
تنہائی کی منزل ہے، عجب منزل ہے
سایہ بھی مرے ساتھ نہیں چلتا ہے



تھا چاند بھی اور اس کا ہالہ یہی کل
ہر بات پہ تھا میرا حوالہ یہی کل
یہ آج مخالف جو بنا پھرتا ہے
دیتا تھا مرے ہات پیالہ یہی کل



کھو کر مجھے تسکین کہاں ہوتا ہے
سب داؤ پہ موجود یہاں ہوتا ہے
اس درجہ زیاں کا میں عادی ہوں فرید
مجھ کو نہیں احساسِ زیاں ہوتا ہے



پاؤں پاؤں یہاں پہ چلتا ہوں کبھی
میں طور طریقہ بھی بدلتا ہوں کبھی
رہتا ہوں کھڑا چٹان بن کر اکثر
اور شمع کی صورت میں پگھلتا ہوں کبھی



کافی ہے کیا غور نہ دیکھا میں نے
تجھ سا تو بہر طور نہ دیکھا میں نے
صورت میں سیرت میں، ادا میں، چھب میں
اس شہر میں اک اور نہ دیکھا میں نے



ہر گام یہ سیدھا مرا چلنا دیکھا
اُٹھتا نہ دھواں ، آگ میں جلتا دیکھا
وہ سیدھ کا ہے بندہ سمجھتا مجھ کو
جس نے نہ کبھی میرا بدلنا دیکھا



میں اُس سے سبک بار ہوں راحت وہ ہے
ہے مال وہ مفلس کا بغایت وہ ہے
جس جذبہ کو رکھا ہے بچا کر میں نے
معلوم نہیں کس کی امانت وہ ہے



آسودہ کروں دل کا تقاضہ کب تک
آنکھوں میں رکھوں عیشِ گذشتہ کب تک
سورج کو نگلنے لگے سائے دیکھو
ہوتا ہے یہاں پر یہ تماشہ کب تک



اخلاص سے ہر قرض چکا دیتا ہوں
آپ اپنے کو راہوں میں بچھا دیتا ہوں
آتا ہے اگر کوئی خوشی سے مرے پاس
پلکوں پہ اسے اپنی بٹھا دیتا ہوں



ہر راہ کو پُر خار بنانے والا
آسان کو دشوار بنانے والا
خود اس کو اُٹھاتا ہے گراتا خود ہے
یہ بیچ کی دیوار بنانے والا



تاروں سے بھرا ہوا تھا اُس رات فلک
بے کل کیئے دیتی تھی جذبوں کی لچک
تو بھول چکا موسمِ خوش کن لیکن
اُس آگ سے اُٹھے گا دھواں دیر تلک



اک رمزِ عجب راغب و مرغوب مجھے
کوئی نہیں کر پائے گا مغلوب مجھے
سانپوں سے بچاتا ہوا بچوں کو پرند
سکھلا کے گیا زیست کا اسلوب مجھے



عجلت میں بسائی گئی اک دُنیا ہوں
سرسبز زمیں ، گاہ گہے صحرا ہوں
اس درجہ سکڑتا ہے کبھی میرا وجود
سوئی کے ناکے سے گزر سکتا ہوں



ہر پھول اک تلوار ہے میں نے دیکھا
ہر چپ میں اک اظہار ہے میں نے دیکھا
اجمال میں تفصیل سے جانچا میں نے
انکار میں اقرار ہے میں نے دیکھا



عاشق ہوں نہ محبوب ہوں آخر یہ کیا !
راغب ہوں نہ مرغوب ہوں آخر یہ کیا!
طاری ہے عجب طرح کا اک مجھ پہ جمود
طالب ہوں نہ مطلوب ہوں آخر یہ کیا!



مہمل تھا سخن حسابوں والا
تھا موسمِ خوش کن وہ گلابوں والا
کر یاد میں پڑھتا تھا فقط چہرہ تیرا
اور بھولا تھا ہر درس کتابوں والا



جذبات نے رُخ پھیر لیا ہے اکثر
مجھ سے مجھے تا دیر لیا ہے اکثر
صندل تو نہیں ہوں میں مگر جانے کیوں
سانپوں نے مجھے گھیر لیا ہے اکثر



نیندوں میں جو شخص چلا ہو اکثر
برفیلی ہواؤں سے جلا ہو اکثر
غیروں پہ بھروسہ وہ کرے گا کیونکر
اپنوں نے جسے لوٹ لیا ہو اکثر



میں عکس کہ آئینۂ حیرانی ہوں
من جملۂ اسبابِ پریشانی ہوں
اب تک میں یہی طے نہیں کر پایا فرید
صحرا ہوں پیاسا ہوں کہ میں پانی ہوں



ہے مجھ کو عیاں اور نہاں پر قابو
مشاق ہوں ہے تیر وکماں پر قابو
جب سے یہ کھلا عیبوں کا پردہ ہے سکوت
رکھتا ہوں میں تب سے زباں پر قابو



پاؤں میں پڑی ہے جو وہ زنجیر نہ کھینچ
سر پر جو لٹکتی ہے وہ شمشیر نہ کھینچ
جذبات کے دھارے پہ رواں ہوں اس وقت
اس حال میں اب تو مری تصویر نہ کھینچ



ہر رُت کو نئی فصل نہیں کہہ سکتا
آنے کو ترے ، وصل نہیں کہہ سکتا
واقف ہوں چمکتا نہیں سونا ہی فقط
ہر اصل کو میں اصل نہیں کہہ سکتا



بے وجہ کسی کا میں یہاں بن نہ سکا
گہہ نفع گہے کارِ زیاں بن نہ سکا
سلگایا جسے غیر کے ہاتھوں نے فریدؔ
اُس آگ کا میں گاڑھا دھواں بن نہ سکا



خود پر یہی فرمان میں جاری کر لوں
اک جذبۂ بے ساختہ طاری کرلوں
نظریں تری مجھ پر ہی جمی رہتی ہیں
میں کس لئے اب تجھ سے نہ یاری کرلوں



تلخابۂ حالات چکھانے والے
بے انت سمندر میں بہانے والے
یکسانیِ حالات سہوں میں کب تک
خوشیوں کو مری چھین کے جانے والے



خوشبو بنے کب رنگ بتائے شاید
اور موم بنے سنگ بتائے شاید
یہ تنگیٔ حالات دکھانے والا
مرنے کا حسیں ڈھنگ بتائے شاید



حیرت سے گراں بار رمق لے آئی
یا زیست کا موضوع اَدق لے آئی
تاویل نہ کر سکا ابھی تک کہ ہَوا
کیوں دوش پہ اک سادہ ورق لے آئی



آئینہ اظہار میں حیرت ہے جواں
اور خواہشِ بھرپور بغاوت ہے جواں
کتنے ہی کھلونے توڑ کے دیکھے پھر بھی
تخریب کا اک جذبہ بغایت ہے جواں



جینے کے لئے تازہ ہوا چاہتا ہوں
ماحول نیا نئی فضا چاہتا ہوں
آسیب زدہ سایوں سے بچنے کے لئے
ہر حال میں اب ماں کی دعا چاہتا ہوں



مانگا جو اُسے نہیں دیا ٹھیک کیا
ہونٹوں کو زبردستی سیا ٹھیک کیا
دکھلا کے تُنک ظرفیٔ حالات فریدؔ
بے خوف مجھے اُس نے کیا ٹھیک کیا



ایک بار اُسے آزما کے دیکھا ہوتا
پنہاں سے نیا وجود پیدا ہوتا
ہے سہل حصول موت واقف ہوں مگر
جینا اگر آتا بہت اچھا ہوتا



اس بات کو اب مان لیا ہے میں نے
خود کو نہیں پہچان لیا ہے میں نے
چالیس برس بعد بھی اب تک نہ فریدؔ
جینے کا ہنر جان لیا ہے میں نے



خود سے میں ملوں ہے یہی چاہت مجھ کو
خواہش ہے مگر یہی بغایت مجھ کو
ہیں پاؤں مرے زخمی تعجب مت کر
ہے نیند میں چلنے کی عادت مجھ کو



کیسے یہ سمجھتے ہو کہ پورا ہوں میں
شیشے کی طرح چورا چورا ہوں میں
ہر زاویئے سے آدھا نظر آؤں گا
واللہ ترے بغیر ادھورا ہوں میں



حالات کا آئینہ دکھا کر مجھ کو
سب وہم ہے اتنا ہی بتا کر مجھ کو
پلکوں کے سبھی خواب کئے چکنا چور
تعبیر کے افسوں سے ڈرا کر مجھ کو



نیت اُس کی لگی مجھے ٹھیک بہت
روشن ہوا امکاں جو تھا تاریک بہت
کانٹوں سے بھرا رستہ اُسی نے سونپا
ہوسکتا ہے یہی ہو نزدیک بہت



بہہ سکتا ہوں غرض وغایت کے بغیر
رہ سکتا ہوں خوش حاصلِ لذّت کے بغیر
میں سنگ صفت مانوں نہ رنگوں کا وجود
جی سکتا ہوں کب تری عنایت کے بغیر



رُکتی ہی نہیں راہ بدلتی ہے پھر
ہم راہ کسی وقت نہ چلتی ہے پھر
ہنگامہ کوئی روح میں جب ہو پیدا
یکسانی شب و روز کی کھلی ہے پھر



روشن یونہی قندیل ہوئی ہے میری
ناسفتگی تحلیل ہوئی ہے میری
رکھتا ہوں اسی لئے میں ماٹی سے اُنس
اس سے ہی تشکیل ہوئی ہے میری



سر چڑھنے لگی تازہ بلا اب جاناں
خوش فہم نہ ہیں مجھ سے یہاں سب جاناں
گر گر کے سنبھلنے سے غلط فہمی ہوئی
جینے کے مجھے آتے ہیں ڈھب جاناں



سانچے میں ابھی تک نہ ڈھلی ہے دُنیا
دھارے پہ ہمیشہ ہی بہی ہے دُنیا
لایعنی جھمیلوں میں اُلجھا کے فرید
حصّوں میں مجھے بانٹ رہی ہے دُنیا



ہر سانس ہے مائل بہ طہارت تب سے
کچھ بھی نہیں ہے وجہ شکایت تب سے
قربت تری جب سے ہے میسر آئی
لگنے لگی ہے زیست عبادت تب سے



اک چہرہ نیا روز دکھاتا ہے کوئی
کچھ میرا نہیں یہی بتاتا ہے کوئی
لے جائے گا سر کاٹ کے گر کچھ نہ ملا
پھر فصل مری کاٹنے آتا ہے کوئی



کھینچے گا مرے جسم سے ہر تیر وہی
پتّھر سے نکالے گا تصویر وہی
پابستگی پر میری جو ہوتا ہے خوش آج
پاؤں سے کل کھولے گا زنجیر وہی



ہو حق میں گرفتار ہے تسلیم زدہ
جذبات سے عاری ہے تعلیم زدہ
شرمندۂ تعبیر ہوں کیونکر کوئی خواب
جب زیست کا ہنگامہ ہے تعمیم زدہ



ہر زہر کو ہنس ہنس کے پینا ہوگا
اک زخمِ جگر کو بھی نہ سینا ہوگا
جب سے یہ کہا مرتا ہوں فرقت میں تری
تب سے یہی تاکید ہے جینا ہوگا



جو کچھ ہے نہاں سب پہ عیاں رہتا ہے
پوشیدہ نہیں کچھ بھی یہاں رہتا ہے
خوابوں کی تجسیم کروں میں کیونکر
ہر لمحہ مرا وقفِ زیاں رہتا ہے



دکھلایا تھا جو پھر سے دکھاتا ہے وہ
بے بس ہوں یہ احساس دلاتا ہے وہ
اس پر بھی ہے تاکید کہ میں اُف نہ کروں
میں شمعیں جلاتا ہوں بجھاتا ہے وہ



یہ سوچ کے ہوتا ہوں اکثر میں حزیں
دراصل اس اک بات پہ ہے پختہ یقیں
ہم ہونگے یہاں پر نہیں لیکن پھر بھی
ہوگا یہ جہاں اور حسیں اور حسیں



رقصندہ میں ہوتا ہوں بسمل ہو کر
جذبوں میں گِرا رہتا ہوں دل ہو کر
کیسا یہ فریدؔ رن پڑا ہے مجھ میں
کٹتا ہوں مگر خود سے مقابل ہو کر



پھر یاد دلاتا ہوں وہ منظر خود کو
پاتا ہوں ذرا بھر میں شناور خود کو
دیکھے ہیں وہ سخت مراحل میں نے
جب دینا پڑا حوصلہ اکثر خود کو



کل تک تھا وہ ہمراز بتاؤں کس کو
اور تھا مرا دم ساز بتاؤں کس کو
حد درجہ روابط تھے ہم دونوں میں
انجام کا آغاز بتاؤں کس کو



تھی اس کی شدید پیاس اُسے کیا دیتا
تھا مجھ کو بھی احساس اُسے کیا دیتا
پھل پھول تو ہیں بعد کی باتیں صاحب
سایہ بھی نہ تھا پاس اُسے کیا دیتا



انداز سکھاتا ہوں بھلا سا خود کو
صحرا میں بھی رکھتا نہیں پیاسا خود کو
ہر جیت میں مضمر ہے یہ اک راز فریدؔ
ہر بار پہ دیتا ہوں دلاسا خود کو



ہر زخم کہن کو نہ ہے سینا مجھ کو
خشکی میں ڈبونا ہے سفینہ مجھ کو
دنیا سے قدم قدم پہ سمجھوتہ کروں
اس طور سے آئے گا نہ جینا مجھ کو



کافورِ غم و رنج والم ہونے تک
کیسے میں جیا دوریاں کم ہونے تک
موقع بھی میسر ہو بتا سکتا نہیں
کیا گزری دل وجاں پہ بہم ہونے تک



بے رنگ ہے رنگوں کی کماں میرے لئے
پیدا بھی یہاں پر ہے نہاں میرے لئے
وہ پھول ہوں جس کا نہیں کوئی موسم
یکساں ہے بہار اور خزاں میرے لئے



تکتا ہوں ہر اک چیز کو ہٹ کر، تب سے
آپ اپنے سے رہتا ہوں کٹ کر، تب سے
اندازہ ہوا جب سے کہ دنیا ہے وسیع
بیٹھا ہوں پروں کو میں سمٹ کر، تب سے



وقفوں میں نہیں یہاں وہ اکثر آیا
گر صبح گیا شام پلٹ کر آیا
کم کرنے مرے گھر کے سونے پن کو
چھت پر نہ ابھی تک وہ کبوتر آیا



کب آگ کے دریا میں اُترنا آیا
حد سے نہ کبھی آگے گزرنا آیا
اک اَندھی ہوا چلتی رہی دیر تلک
شاید کہ مجھی کو نہ بکھرنا آیا



ہے کیف سے بھرپور تمہاری آنکھیں
حد درجہ ہیں معمور تمہاری آنکھیں
پی پی کے اُسے عمر گزاروں میں بھی
جس مے سے ہیں مخمور تمہاری آنکھیں



آنکھوں سے کبھی ہم نے سنوارے ہی نہ تھے
اور نقش کبھی ان کے اُبھارے ہی نہ تھے
شرمندۂ تعبیر وہ ہوتے کیونکر
جو خواب حقیقت میں ہمارے ہی نہ تھے



سایا کبھی دامن کو بچا دیتا ہے
ہوں جسم سے بالا یہ بتا دیتا ہے
خنکی نہیں ہوتی ہے سدا یادوں میں
پنکھا بھی کبھی گرم ہوا دیتا ہے



ہر سانس سے تلوار کہاں جاؤں گے
ہر راہ ہے دشوار کہاں جاؤں گے
ہو جائیں گے پاؤں تمہارے زخمی
ہر گام ہے پر خار کہاں جاؤ گے



ہر حال میں پیچھے ہی رہے جاتے ہیں
جذبات میں لیکن نہ بہے جاتے ہیں
اِک وہ کہ نہیں پھول گوارا ان کو
اک ہم ہیں کہ خنجر بھی سہے جاتے ہیں



میں تیرے سوالوں کا دوں کیسے جواب
میں غم سے گراں بار ہوں بے حد و حساب
وہ باب مری عمرِ گذشتہ کا ہے
جس کو تو سمجھتا ہے نئی تازہ کتاب



بے سمت قدم کو نہ ٹھہر جانے دے
اس کام میں اب حد سے گزر جانے دے
جینے ہی نہیں دیتا ستم جس کا فریدؔ
اُس ایک ستم گر پہ مجھے مرنے دے



خودکو میں رکھوں اوروں کے بس میں کب تک
غیروں کو بناؤ ہم نفس میں کب تک
جس میں کوئی کھڑکی ہے نہ دروازہ کوئی
میں قید رہوں اُس اک قفس میں کب تک



ہے ذات مری مثل گلستاں ہمہ رنگ
ہے رات مری مثل شبستان ہمہ رنگ
گر چھوڑ بھی دیتا ہوں کبھی منزل کو
پاتا ہوں بخود وادیٔ امکاں ہمہ رنگ



موہوم ہے خوابوں کی فضاء جیتے ہیں
اور کرتے ہیں جینے کی دُعا جیتے ہیں
وہ سرو ہے آزاد اُسے کیا معلوم
کس طور سے اربابِ وفا جیتے ہیں



بے وجہ کبھی پاس نہ آتے ہیں خواب
کیا ہم پہ گزر جائے بتاتے ہیں خواب
ڈستے ہیں بہت جاگ کے منظر مجھ کو
جو آنکھ کروں بند ستاتے ہیں خواب



ہاتھوں میں لئے نکلا ہوں میں ایک چراغ
شاید یونہی مل جائے کہیں اپنا سراغ
مدت ہوئی اک راہ میں خود کو کیا گم
نے خواب نہ آرام نہ ہے مجھ کو فراغ



ہوں پیاس کہ ظلمات یہ اب تک نہ کھلا
کیسا ہے طلسمات یہ اب تک نہ کھلا
جلتا ہوں نہ بجھتا ہوں کئی دن سے فرید
کیسی ہے کرامات یہ اب تک نہ کھلا



روزانہ نیا قصّہ سنا لیتا ہوں
ہر دن میں جنم ایک نیا لیتا ہوں
جو کل تھا وہی پھر نہ نظر آجاؤں
ہر صبح نیا خود کو بنا لیتا ہوں



نَے مہر سے خوش نہ کج ادائی سے خوش
واللہ ہوں میں تیری خدائی سے خوش
پائی ہے عجیب ایک طبیعت میں نے
نَے وصل سے ہوں اور نہ جدائی سے خوش



کس لمحۂ موہوم کا دم ساز ہوں میں
کوئی نہ اُٹھائے جسے وہ ناز ہوں میں
جس پر نہ توجہ دی کسی نے اب تک
صحرا میں وہ بکھری ہوئی آواز ہوں میں



اک سائیگی حائل ہے بہت مشکل ہے
قابو میں نہ اب دل ہے بہت مشکل ہے
اغماض نہ اس طرح برت خود سے فریدؔ
جینا بڑا مشکل ہے بہت مشکل ہے



جاگیر رہی دل میں گھٹن دیر تلک
سایوں نے بھی پھیلا دیا پھن دیر تلک
وہ تُو تھا کہ وہ بھولتا سنّاٹا تھا
شب کوئی رہا محوِ سخن دیر تلک



امکاں نہیں اب روپ بدل جانے کا
پانی میں، ہوا میں نہیں ڈھل جانے کا
ہوں برف کہن سال نہ ہے خوف کوئی
سورج کی تمازت سے پگھل جانے کا



مہمل سے جوابوں کی طرح یاد نہ آ
بھولے ہوئے خوابوں کی طرح یاد نہ آ
جن میں نہ ہی خوشبو ہے نہ ہی کوئی رنگ
اُن سوکھے گلابوں کی طرح یاد نہ آ



جذبات کا آہنگ ہے کم کم مجھ میں
جو دھن بھی ہے باقی ہے مدھم مجھ میں
وہ جب سے گیا ہوگیا ہوں بے چہرہ
بے رنگ ہے بے کیف ہے موسم مجھ میں



ہے موردِ اکرام نظر میرے سوا
راضی ہے بہ انداز دگر میرے سوا
رونا ہے اُس اک بات کا رونا ہے فریدؔ
وہ سب کا یہاں پر ہے مگر میرے سوا



پہروں خود سے رہتا ہوں محو کلام
ہے ذکر سحر اور نہ ہے فکرِ شام
وہ دن گئے رکھتا تھا ہر اک کی خبر
اب کام سے اپنے میں رکھتا ہوں کام



رکھتا نہیں اب آہ و زاری سے کام
شوریدہ سری نہ بے قراری سے کام
اس طرز سے زندگی گزرتی ہے فریدؔ
ہر آن ہے اب وقت شماری سے کام



مٹی کی تلاش ہو وہ سونا دے گا
جیسے کی طلب ہو وہ نہ ویسا دے گا
بہتر ہے یہی اسے نہ کچھ بھی مانگوں
مانگوں میں اگر زشت وہ زیبا دے گا



جو نقش اُبھارا وہ خیالی نکلا
اک لحظہ طلب کا نہ مثالی نکلا
تو آیا نہ ہی خود سے ملاقات ہوئی
لو آج کا دن بھی یونہی خالی نکلا



ہر لمحہ تعلق سے سجایا سچ مچ
ہر قول و قسم دل سے نبھایا سچ مچ
تو نے بھی نکالی ہے کدورت دل سے
میں نے بھی تجھے دوست بنایا سچ مچ



وہ کر گیا مہمل سے جوابوں میں گم
حاصل ہے یہی ہوں میں عذابوں میں گم
اک وہ کہ میسر اُنہیں دریا دریا
کہ میں کہ ابھی تک ہوں سرابوں میں گم



ہے سہل نہ میں اس کا یقیں کر سکتا
اب تک نہ کیا مہر جبیں کر سکتا
وابستہ ہوں دنیا سے یہ مانا لیکن
میں تجھ سے الگ خود کو نہیں کر سکتا



پانی پہ ہوں اک منظرِ لرزاں کی طرح
بردوش ہوا ورقِ پریشاں کی طرح
پھرتا ہوں تری طلب میں کوچہ کوچہ
آ جا گتا ہوں شمع فروزاں کی طرح



لطف و کرم یار میں بیٹھا ہوں ابھی
اک نشۂ پندار میں بیٹھا ہوں ابھی
مت چھیڑ ابھی جہد و عمل کے قصے
میں سایۂ دیوار میں بیٹھا ہوں ابھی



کہتا نہیں کچھ دہر کی کلفت کے خلاف
پیتا ہوں ہر ایک زہر عادت کے خلاَف
وہ گھر سے نکلنا ہو کہ واپس آنا
کرتا ہوں ہر اک کام طبیعت کے خلاف



ساقی نے کہا ہر اک سبو تیرا ہے
یہ ابر، ہوا، روئے نکو تیرا ہے
پہلے ہے یہی شرط کہ اپنا ہو جا
پھر اِس کے بعد چار سو تیرا ہے



تنہائی ہے میں ہوں اور شام ہے اب
تھوڑا سا عنایت سے آرام ہے اب
دنیا کا سر اک کام نبیڑا میں نے
بس خود کو کروں یاد یہی کام ہے اب



نادیدہ مقامات دکھاتا ہے کوئی
ہوں اصل میں ہی یہی بتاتا ہے کوئی
تُو تُو کا پڑھا میں نے وظیفہ اک عمر
میں میں کا سبق مجھے پڑھاتا ہے کوئی



میں بھی ہوں کم کوش غلط صاف غلط
ہوں حال میں مدہوش غلط صاف غلط
وہ لمحۂ خوش کن جو ترے ساتھ کٹا
کرلوں میں فراموش غلط صاف غلط



لکھتا ہوں غم و رنج کی تختی اے دل
حاصل ہے فقط تیری دولختی اے دل
دنیا کی طلب میں کبھی عقبیٰ کے لئے
تا عمر اُٹھائی میں نے سختی اے دل



امکاں سے پرے وہم وگماں سے آیا
یا صبح ازل نفع وزیاں سے آیا
جانا ہے کدھر یہ بھی نہیں ہے معلوم
باور نہیں یہ بھی کہ کہاں سے آیا



زندہ ہوں ابھی ذوقِ نظارا لے کر
جیتا ہوں میں یادوں کا سہارا لے کر
دنیا پہ رکھا زخموں کا اپنے الزام
شکوہ نہ کیا نام تمہارا لے کر



حد درجہ ہوں۔ بے قرار ! میں تیرا ہوا
پیہم ہے انتظار ! میں تیرا ہوا
اک لحظ نہ جی سکتا ہوں میں تیرے بغیر
جا دور نہ میرے یار! میں تیرا ہوا



لمحاتِ گریز پا کا سرمایا ہوں
معنی کی قسم اصل میں اک کایا ہوں
آؤں گا نہیں ہاتھ یہ کوشش مت کر
سایا ہوں سایا ہوں میں سایا ہوں



فرمان کا ہر ردّ عمل میں نے لیا
اس پیڑ سے پھول اور پھل میں نے لیا
مصروف رکھوں خود کو عجب دھندں میں
یہ بار گراں صبحِ ازل میں نے لیا



طوفانِ حوادث سے اُبھرتا ہوں کبھی
دم ہونے کا اپنے آپ بھرتا ہوں کبھی
رکھتا ہوں گرو خود کو کبھی مثل ظفرؔ
بابرؔ کی طرح عیش بھی کرتا ہوں کبھی



آنکھوں میں عجب خوابوں کو پالا میں نے
طرزوں سے نئی روز سوالا میں نے
ڈھالا نہ ابھی خود کو کسی سانچے میں
دُنیا کو نہیں دل سے نکالا میں نے



خنجر سے نہ ہی تیغ نہ تلوار سے ڈر
منبر سے نہ ہی جبہ و دستار سے ڈر
دھندلاتا ہے یک لخت یہ ہر نقش و نگار
اس تیز قدم وقت کی رفتار سے ڈر



با ہوش تھا لیکن میں بے ہوش رہا
زندہ تھا موت سے ہم آغوش رہا
ایسے بھی مقاموں سے گزارا ہوں فریدؔ
وہ کہتا رہا اور میں خاموش رہا



ہر خواب مرا پھر سے جواں ہو جائے
طے مرحلۂ سود و زیاں ہوجائے
کر مجھ کو عنایت وہ بھر پور فضا
صدیوں کی تھکن دور جہاں ہو جائے



آنکھوں میں رہے ذوقِ تماشہ کب تک
سوتا رہے گا میرا نصیبہ کب تک
تا صبح رہو ساتھ، اکیلا ہوں بہت
کرلوں میں ستاروں سے تقاضہ کب تک



آ پاس نہ کرصرف نظارا ہر شب
اے چاند ہے تیرا ہی سہارا ہر شب
ٹوٹی ہوئی سانسوں سے ڈھڑکتے دل سے
تا صبح تجھے میں نے پکارا ہر شب



میں نے جو کہا مجھ کو رکھا سب سے الگ
شکوہ یہ کیا کیوں نہ کہا سب سے الگ
میں نے جو کہا اچھی نہیں ہے تفریق
اس بات پہ ہی مجھ کو کیا سب سے الگ



ہوں وصل گزیدہ نہ ہے واصل کوئی
یاں اپنے سوا نہ ہے مقابل کوئی
جز تیرے کسی کو میں بتا بھی نہ سکوں
طوفان میں ہوں اور نہ ہے ساحل کوئی



ہوں اب میں کسی کا نہیں ہونے والا
اب جاگ گیا کل تھا سونے والا
وہ دیر و حرم سے ہے الگ بالکل الگ
جس راہ میں ہوں خود کو میں کھونے والا



بے کل ہوں بے حساب چارہ کر چارہ
پیہم ہے اضطراب چارہ کر چارہ
آتا ہے جو بھی پاس چلا جاتا ہے
پانی ہوں نہ ہوں سراب چارہ کر چارہ



پرلطف ہوا کیف بہاری لے کر
وہ چیز جو خواہش تھی ہماری لے کر
جس نے کہ فریدؔ آنکھیں بجھائیں سب کی
اب آتا ہے رنگوں کی سواری لے کر





جن سے نہ تعلّق ہو وہاں سے آئے
بے نام اک آسودہ مکاں سے آئے
اپنوں کی ہو یا غیر کی بھیجی ہوئی آگ
مقصود بجھانا ہے جہاں سے آئے



ہوں برف کہن سال میں پانی ہو جاؤں
اے صورتِ امروز معانی ہو جاؤں
اُس لمحے کا انتظار کرتے ہی بنی
جس میں کہ حقیقت سے کہانی ہو جاؤں

پسِ نوشت

فرید پربتی کی رُباعیاں........ایک جائزہ

محمد ارشد

اُردو ادب کے شعری مناظر نامے کا جائزہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ جس طرح دیگر اصناف مثلاً غزل، نظم، مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ کا وقتاً وقتاً انتخاب عمل میں لایا گیا۔اس طرح کا سلوک رباعی کے ساتھ روا نہیں رکھا گیا، حالانکہ رباعی کے آثار ہمارے ادب میں ابتداء ہی سے پائے جاتے ہیں اور اس کا وافر سرمایہ بھی موجود ہے۔اس صورتحال کے پیچھے جو اسباب کارفرما ہوں۔اس کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں۔البتہ ایک دو باتوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔امجد حیدر آبادی اور رواں ایسے شاعر ہیں جو صرف اپنی رباعیوں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ جوش، فراق اور یگانہ نے بھی کثرت سے رباعیاں کہی ہیں۔جدید شعراء نے بھی رباعی کی طرف تھوڑی بہت توجہ کی ہیں ان میں مظفر حنفی، کمار پاشی، شمس الرحمان فاروقی اور مخمور سعیدی وغیرہ کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔دوسرے یہ کہ ہر دور میں غزل کا جادو اس طرح چڑھ کر بول رہا ہے کہ باقی اصناف پر پسماندگی کی گرد چڑھ گئی۔

''رباعی''، فنی اعتبار سے ایک مشکل صنف سخن ہے۔یہ صنف ہماری شعری روایات کے اس حصے سے وابستہ ہے جس میں اساتذہ سے کسبِ فیض کے ساتھ ذاتی مشق اور ریاضت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ایک مقررہ بحران وزن کی قید میں رہ کر اور وحدتِ فکر اور تسلسل بیان کا لحاظ رکھتے ہوئے

اک رنگ شکستہ ہی، صانع ہوتا
ہاں جہد مسلسل سے میں یہ مانع ہوتا
بجھ کے رہ جاتی میری شورہ طلبی
میں موت پہ یازیست پہ قانع ہوتا



خاشاک وجود ایک بھنور میں رہتا
اے بے خبری اپنی خبر میں رہتا
سانسوں نے نہیں چھوڑی وظیفہ خوانی
مصروف میں کیا کارِدگر میں رہتا

رباعی کے بارے میں یہ عام مفروضہ ہے کہ اسے صرف حکیمانہ مضامین کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بعد کے شاعروں نے اس کلیے کو توڑنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ فریدؔ پربتی کی رباعیاں بھی متنوع اور ہمہ جہت موضوعات کی حامل ہیں۔ انہوں نے اسے کسی خاص موضوع سے مختص نہیں کیا، بلکہ اسے گوناگوں موضوعات کے لئے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے حمدیہ رباعیاں بھی کہیں ہیں صوفیانہ اور اخلاقی موضوعات پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ حسن وعشق کے موضوعات کو بھی برتا ہے اس کے علاوہ ان کی رباعیوں میں عصری اور تازہ حسیت کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر انتشار پرور دور میں ادب پروان چڑھتا ہے۔ گزشتہ دودہائیوں سے اہل کشمیر جس بے چارگی اور بے یقینی کی زندگی گزار رہے ہیں، وہاں کے پے در پے خلفشار کے ماحول میں شعراء وادباء کے لئے قلم کے تقدس اور فکر کی حرمت کو قائم رکھنا یقیناً ایک مسئلہ رہا ہے۔ فرید پربتی نے ایسے پُرآشوب دور میں بھی اپنے فکر وقلم کے تقدس کو حالات کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا اور یہ ان کے تخلیقی وجدان کا بھی اعجاز ہے کہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے تخلیقی شعور کو شعری جامہ پہنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

فریدؔ پربتی اپنے شعری طریق اور طرزِ اظہار میں منفرد ہیں۔ وہ نہ صرف شعری روایت سے

اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا یقیناً ایک مشکل امر ہے۔اختصار کے ساتھ جامعیت کی جو صفت پائی جائی ہے، شاعر سے بڑی توجہ اور بصیرت کا متقاضی ہے۔اس جادہ سخن کو وہ سخن ور سر کر سکتا ہے جو اپنی شعری روایت سے آگہی کے ساتھ زبان و بیان کے بنیادی نکات سے کماحقہ واقفیت رکھتا ہے۔

آج جب کہ غزل اور نظم میں نظم معریٰ، آزاد نظم یہاں تک کہ نثری نظموں کا چلن اس قدر عام ہوگیا کہ شاعر کیلئے ''رباعی'' جیسی ریاض طلب صنف میں طبع آزمائی کرنا یقیناً ایک خوش آئند عمل ہے۔ فریدؔ پربتی ہمارے دور کا ایک ایسا خوش اور جواں فکر شاعر ہے جس کو غزل کے علاوہ رباعی میں بھی شعر کہنے کا ملکہ حاصل ہے۔یوں تو وہ غزل میں اپنے منفرد لہجے اور مخصوص طرزِ فکر کے ذریعہ دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ان کی رباعیات ریاضتِ فن کا بہترین نمونہ ہیں۔جس میں فن کے جمالیاتی انسلاکات کو برقرار رکھتے ہوئے شاعری کے سماجی شعور کو مزید توانائی عطا کرنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے۔کرشن کمار طور نے بجا طور پر کہا ہے۔

''ڈاکٹر فریدؔ پربتی کی رباعیاں ذہن کی اطرافی عبارت اور جودت سے نہ صرف معمور ہیں بلکہ ان میں خلاقی کی وہ تیزی و توانائی اور تندی بہ صراحت موجود ہے جو کسی فن پارہ کو تیز فہم اور زیرک احتیاط سے صیقل کرتی ہے''۔

فریدؔ پربتی کا تعلق وادیٔ کشمیر سے ہے۔ایک ایسے خطے سے جہاں ادب میں استاد اور شاگردی کی روایت نہیں پائی جاتی ہے۔شاعر کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کیلئے اپنے تخلیقی اور فنی شعور پر انحصار کرنا ہے اور یہی چیزیں اس کے لئے جادۂ سخن کی منزل میں رہبری کا کام کرتی ہیں۔فرید پربتی نے اپنی رباعیوں میں جس سادگی و پرکاری کے ساتھ اپنے خیالات و مشاہدات کو شعری پیراہن عطا کر کے وہ اردو شاعری میں ایک نئے آہنگ کا نقطہ آغاز بن سکتا ہے۔حال ہی میں ان کی رباعیون کا مجموعہ ''فرید نامہ'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔جس کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ان کی رباعیوں کے مطالعہ سے جو پہلا تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کی عمارت ذاتی تخلیقی توانائی اور جذبۂ اظہاری مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ان کی رباعیوں کا اپنا اندازِ بیان اور حسن ہے جس میں ایک توانا نظامِ فکر نظر آتا ہے۔اس کا منفرد رنگ و آہنگ اور لہجہ، اس کی شیرینی و نغمگی قاری پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے۔

خالی نہیں رہ سکتا ہوں وہ جانتا ہے
زخموں کیلئے تازہ نمک بھیجتا ہے



طوفان حوادث میں بکھرتا ہے وجود
اک آگ کے دریا سے گزرتا ہے وجود
ہے غولِ بیاباں کا تعاقب شب وروز
اس تیرہ خاک داں میں ڈرتا ہے وجود



فریدؔ پربتی نے اپنی رباعیوں میں ایسے آفاقی مسائل کو بیان کیا ہے۔ جس سے آج تمام انسانی معاشرہ دوچار ہے اور یہ مسائل کسی مخصوص خطہ ارض سے وابستہ نہیں، سائنس اور فکر کی ترقی نے پورے انسانی معاشرے کا چہرہ مسخ کردیا ہے اور پرانی تہذیبی اقدار دھیرے دھیرے ازکاررفتہ بن رہی ہے اس کی جگہ ایک تجارتی اور صارفی سماج وجود میں آرہا ہے جس میں سب کو صرف اپنی ذات سے غرض ہے دوسروں کے جذبات واحساسات کی پرواہ نہیں۔

بڑھتا ہے اب احساس زیاں روز بروز
جلتا ہے آسودہ مکاں روز بروز
بدلہ ہے چمن بدلا ہے گلچیں کا مزاج
خوابوں کا یہاں اڑتا ہے دھواں روز بروز



شیرازہ محبت کا پریشان ہوا
غارت عیش وسکون کا سامان ہوا
اس دور میں جیتا ہوں جس میں انسان
وحشی و درندہ اور حیوان ہوا



واقفیت نہیں رکھتے ہیں بلکہ وہ ہماری کلاسیکی شاعری اور اس کی روایت سے حسب توفیق استفادہ بھی کرتے ہیں ان کے یہاں نہ تو صرف روایت پرستی ہے اور نہ ہی روایت سے کلی انحراف پایا جاتا ہے ۔شعری روایات کے شعور نے ان کے شعری ادراکات کو زیادہ نکھارنے اور سنوارنے میں اہم فریضہ انجام دیا ہے ۔ جمالیاتی شعری اور روایات سے آگہی کے ساتھ انہوں نے ملک کی عام تہذیبی و روحانی اور انسانی روایات و اقدار کا بھی گہرا عرفان حاصل کیا ہے ۔ جس کے سبب درد غم ان کے تخلیقی وجدان کا حصہ بن گئے ہیں اس لئے ان کی رباعیوں میں وہ ساری آوازیں نظر آتی ہیں جو کسی زخمی دل سے آہ کی صورت میں نکلتی ہے۔

ناپید ہے ہر وہم وگماں ،اپنے سوا
ملتا ہی نہیں کوئی نشاں ، اپنے سوا
اک گنبد بے در میں مقید ہوں میں
آواز کسے دوں میں یہاں ، اپنے سوا



خوابوں کی رقابت ہے کہاں تک جاؤں
اب کیسے بھلا اپنے مکاں تک جاؤں
اپنے ہی تعاقب میں ہوں سرگرداں
اس گنبد بے درمیں جہاں تک جاؤ ں

فریدؔ پربتی کی اس نوع کی رباعیوں میں عصر حاضر میں تہذیبی انتشار کے سبب معاشرتی نظام میں پیدا ہوئی بے راہ روی ،انسانی اقدار کی شکست وریخت ،فرد کے شخصی مسائل جیسے تنہائی ، بے چارگی ، کرب ذات اور اس کے وجود مسائل وغیرہ، سماج اور معاشرہ میں عوام کے روز مردہ مسائل کا بیان اور استعماری طاقتوں کے خلاف احتجاجی آہنگ کی صداقت کے ساتھ نہایت فکر انگیز نظر آتا ہے ۔جس میں طرز اظہار کہیں سیدھا سادہ ہے اور کہیں علامات واستعارات کے ذریعہ بات کو واضح کیا گیا ہے۔

پھولوں سے چرا کر وہ مہک بھیجتا ہے
آکاش کی خوش رنگ دھنک بھیجتا ہے

فریدؔ پربتی کی رُباعیاں

منظر اعجاز

پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ فریدؔ پربتی اپنے معاصرین کے درمیان منفرد قلم کار ہیں۔ ان کا قلم جہتِ کثیر کا حامل ہے اور ہر جہت سے خوش فکر، خوش رنگ اور خوش آہنگ بھی ہے۔ میں نے ان کی نثری اور شعری تحریریں پڑھی ہیں اور خود ان ہی کی زبانی سنی بھی ہیں۔ ان کی شخصیت میں وادی کشمیر کا حسن جلوہ گر نظر آتا ہے اور اس حسن کا انہیں احساس بھی ہے بلکہ وہ کسی نہ کسی پیرائے میں اکثر اس کا اظہار بھی کر جاتے ہیں۔ وہ رباعی ملاحظہ ہو، جو میں خود ان کی زبان سے سن چکا ہوں:

واقف میں ہر اک خواب کی تعبیر سے ہوں
میں حسن ہوں اور حسن کی جاگیر سے ہوں
کہتے ہیں مجھے یوسفِ ثانی اے دوست
کنعاں سے نہیں، وادیٔ کشمیر سے ہوں

فریدؔ پربتی نے دلّی کی ایک مخصوص شعری نشست میں یہ رباعی سنائی تھی۔ داد دینے کے معاملے میں گرچہ مجھے بخیل سمجھا جاتا ہے لیکن اس موقع پر میری بے ساختہ داد کے نتیجے میں اہلِ محفل ان کے بجائے میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ فریدؔ پربتی کی شخصیت جاذبِ نظر بھی ہے اور جادو اثر بھی۔ وہ واقعی یوسف ثانی کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ اس لئے مجھے ان کی رباعی میں اس وقت بھی تعلّی کی بجائے حقیقت نظر آئی۔ اس رباعی کے فنی محاسن بھی شاعرانہ کمالات کے حامل ہیں۔

یہ ایک عام خیال ہے کہ فن کا معیار متعین کرنے کے لئے متعلقہ فن پارے کا کثیر الجہت

فرید پربتی کی رباعیاں جہاں دُکھی انسانیت کا اظہار ہے تو وہاں امن و امان اور محبت کے نغمے اس اُمید کے ساتھ نئی آس دکھاتے ہیں کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ سارا معاشرہ بدل جائے گا اور ہر طرف امن ہی امن ہوگا۔

دنیا نئے سانچے میں ڈھل جائے گی
ہاں فطرت آدم سنبھل جائے گی
حالات بدل جائیں گے پھر اس کے بعد
اس ظلم کی بنیاد بھی بدل جائے گی



بہرکیف فرید پربتی کی رباعیاں ان کی جولانی فکر اور ذہنی وجودت کا نتیجہ ہے، اس میں گہرائی بھی اور گیرائی بھی ہیں۔ انھوں نے رباعی کے اصل مزاج کو برقرار رکھا ہے۔ اس میں خلاقی کی وہ تیزی و توانائی بدرجہ اُتم موجود ہیں جو کسی فن پارہ کو اعتبار بخشتی ہیں۔ ان کی رباعیاں طرزِ فکر اور پیرایۂ اظہار دونوں اعتبار سے انفرادیت کی حامل ہیں اس میں دل بستگی کے ساتھ ذات، حیات و کائنات فرد کی محرومیاں و ناکامیاں، موجودہ دور کا درد و کرب جیسے موضوعات بدرجہ اتم موجود ہیں۔



ان دونوں صنفوں کے موضوعات میں ان کے یہاں کوئی اختصاص وامتیاز نہیں۔

فریدؔ پربتی کی رباعیوں میں نہ تو عاشقانہ کیف وسرور ہے نہ رندانہ مستی۔ان میں واعظ وپند ونصائح بھی نہیں، درس اخلاق کا میلان بھی نہیں۔فلسفیانہ اور حکیمانہ رنگ وآہنگ بھی نہیں۔لیکن ایک چیز بہت ہی نمایاں نظر آتی ہے اور حزن وملال کا عنصر۔اور یہی خصوصیت ان کی غزلوں میں بھی نمایاں طور نظر آتی ہے۔چند رباعیوں سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خوابوں کی رقابت ہے کہاں تک جاؤں
اب کیسے بھلا اپنے مکاں تک جاؤں
اپنے ہی تعاقب میں ہوں سرگرداں
اس گنبد بے در میں جہاں تک جاؤں

❊❊

لمحات گریزاں کو سمٹ کر دیکھا
اور عصر رواں سے بھی کٹ کر دیکھا
یادوں کی اذیت ہی فقط ہاتھ آئی
ماضی کی طرف جب بھی پلٹ کر دیکھا

❊❊

ہر سمت سے ہوں میں ہدف یا مولیٰ
ہے سنگ زنی چاروں طرف یا مولیٰ
ہے کون مدد گار میرا تیرے سوا
ہر شخص ہے شمشیر بکف یا مولیٰ

❊❊

ان رباعیوں کا رنگ ہم عصر متغزلانہ میلان سے ہم آہنگ ہے ان رباعیوں میں جن معاملات ومسائل انعکاس دکھائی دیتا ہے وہ نہ صرف ہم عصر متغزلانہ روایت کے عمومی مسائل ہیں بلکہ

مطالعہ لازمی ہے مثلاً اگر رباعی کے فن پر گفتگو ہو رہی ہے تو اس کا عروضی نظام ،فکری و معنوی منہاج، لسانی یا لفظیاتی طریق کار وغیرہ۔ میں یہاں صرف فکری و معنوی جہت کو ہی ملحوظ رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ فی الحال یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

عام طور پر رباعی کو چار مصرعوں کی چوٹ کہا جاتا ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ رباعی کے چوتھے مصرعے کو نشتر کی طرح ہونا چاہئے کیونکہ یہی مصرع شاعر کی فکری سطح اور زبان و بیان پر اس کی قدرت کو واضح کرتا ہے۔ پہلے تین مصرعے عموماً ایک فضاء کی تعمیر کر دیتے ہیں اور چوتھا مصرع اس کے نتیجے کو نمایاں کرتا ہے۔اس دائرہ مطالعہ کے تحت مشمولہ بالا رباعی پر پھر سے غور کریں۔

رباعی کا پہلا مصرع عمومی معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک مفرد سا بیان ہے۔ دوسرا مصرع بھی: ’’میں حسن ہوں اور حسن کی جاگیر سے ہوں‘‘ ایک مفرد سا بیان ہے۔ یہ دونوں بیانات معنوی سطح پر ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے لیکن جب تیسرا مصرع: ’’کہتے ہیں مجھے یوسفِ ثانی اے دوست‘‘ پڑھتے یا سنتے ہیں تو ذہن فوراً جناب یوسفؑ کے حسن، ان کے خواب اور تعبیر خواب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس ے ساتھ ہی ایک سازگار معنوی فضاء یا ماحول ابھرتا ہے۔ گویا تیسرا مصرع پہلے اور دوسرے مصرعوں کو مربوط کر کے ایک فضاء کی تعمیر کر دیتا ہے اور چوتھا مصرع ’’کنعاں سے نہیں، وادیٔ کشمیر سے ہوں‘‘۔ وادیٔ کشمیر سے ہوں ’’یوسف ثانی‘‘ کی معنونیت کو نمایاں کرتے ہوئے نتیجہ خیز صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس طرح منہاج ،فکر و نظر اور قدرت زبان و بیان بے مثال نظر آنے لگتی ہے۔ اس رباعی کا معنوی حسن و اثر اس وقت اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے جب وہ کسی شعری نشست یا مشاعرے میں یہ رباعی خود سناتے ہیں۔ کیونکہ ان کا آبائی تعلق وادیٔ کشمیر سے ہے اس وادی کا سارا حسن ان کی شخصیت میں سمٹا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ واقعی یوسفِ ثانی نظر آتے ہیں اس لئے رباعی شاعرانہ تعلّی کے بجائے مبنی برحقیقت یا حقیقت حال کی آئینہ دار معلوم ہوتی ہے۔

رُباعی کی صنف سے فریدؔ پربتی کی قلبی وابستگی اور تخلیقی دلچسپی قابلِ لحاظ ہے۔ ان کے ہم عمر معاصرین میں رباعی کہنے والے لوگ بہت ہیں۔ اوروں کے یہاں یہ صنف ضمنی اور ذیلی حیثیت رکھتی ہے۔ فریدؔ پربتی اس سلسلے میں وحید و فرید ہیں۔ ان کے یہاں رباعی اول حیثیت اور بنیادی اہمیت کی حامل دکھائی دیتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وہ غزل گو سے بہتر رباعی نگار ہیں۔ حالانکہ

ہجومِ آئینہ

خود فریدؔ پربتی کی غزلیں بھی انہیں معاملات ومسائل سے دوچار نظر آتی ہیں۔ آشوب عصر کے مطالعے اور مشاہدے میں فرید پربتی کا زاویہ نظر سودا سے قریب اور اس کے اظہار کا آہنگ میرؔ کے رنگ سے قریب نظر آتا ہے ویسے بھی فریدؔ پربتی کے علمی اکتسابات میں کلاسکیت پر زور زیادہ رہا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ فریدؔ پربتی کے اسلوب اور لہجے کو سنوارنے نکھارنے میں کلاسیکی شعری روایت نے اہم کردار ادا کیا ہے چنانچہ روایت اور جدیدت کا ایک حسین امتزاج لسانی رویے اور لفظیات نظام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔





خلوص و مہر و مروّت کا استعارہ بھی
وہی ہے مہر ہدیٰ نور کا منارہ بھی
یہ منکشف شب معراج ہو گیا آخر
کہ وہ نظر بھی ہے منظر بھی ہے نظارہ بھی
کرم انہیں کا بچاتا ہے تند و موجوں سے
سفینہ بھی ہیں وہی اور ہیں کنارہ بھی
علاج ان کے سوا کس سے مانگنے جاؤں
ہیں چارہ گر بھی وہی میرے اور چارہ بھی
انہیں کے حکم سے اصنام سجدہ ریز ہوئے
کیا ہے چاند اشارے سے پارہ پارہ بھی
ان کی فکر سے ہے میری زندگی آباد
انہیں کے ذکر پہ کرتا ہوں میں گذارہ بھی



توحنابستی و من معنی رنگیں بستم

............غالبؔ



خواب میں سارے نئے آنکھ پرانی میری
ہے تضادات سے بھر پور کہانی میری

میں نہ کہتا تھا تجھے اندھی ہَوا سے بچنا
سن کے بھی ایک یہی بات نہ مانی میری

کھا گیا کرب زمانہ میرے لہجے کا جلال
عام تھی ورنہ یہاں شعلہ بیانی میری

اُفقِ دل پہ یہ بجھتا ہوا رنگوں کا ہجوم
مانگتا رہتا مجھی سے ہے نشانی میری

دن کا ہر زخم میں راتوں کو گنا کرتا ہوں
دن ہے بے کیف مرا رات سہانی میری

میٹھے چشموں سے جو گزرو گے یقیں ہے مجھ کو
یاد آئے گی بہت تشنہ دہانی میری

پھیلنا ہے مری فطرت میں کہ ہوں موجۂ گل
رائیگاں جائے گی کب خوئے روانی میری





پھول ہیں دستِ مبارکؐ تو دہن خوشبو ہے
شاہِ لولاک کا ہر حرفِ سخن خوشبو ہے

امتزاج ایسا ہے دونوں میں بتانا ہے محال
پیرہن ان کا ہے خوشبو کہ بدن خوشبو ہے

ان کا گفتار ہے یا بوئے رواں کی تفسیر
بات ہے نافہ زباں عطر دہن خوشبو ہے

ہر بُن مو سے نکلتی ہے سمن کی خوشبو
شاہِ کونین کا ہر جزو بدن خوشبو ہے

سیرِ افلاک یہ نکلے ہیں خدا کے محبوبؐ
مہکی مہکی ہے فضا سارا گگن خوشبو ہے

آپؐ کا دور حقیقت میں مثالی ہے فریدؔ
پھول اصحاب ہیں اور فخرِ زمن خوشبو ہے



تجھ کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس
خواب کیا آنکھوں میں اب کے اشکِ غم میرا نہیں

ہر تعلّق اب بدلتا ہوں میں بستر کی طرح
رات بھر میرا جو تھا وہ صبح دم میرا نہیں

ڈوبنے پر بھی سہارا میں نہیں کرتا طلب
ہاتھ موجوں میں جو ہو جائے علم میرا نہیں

عافیت ہے بے تعلّق اُس سے رہنے میں فریدؔ
ہر ستم پر جو کہے دستِ ستم میرا نہیں





وادیٔ اِمکاں میں اب کے کچھ بہم میرا نہیں
سارے آہو میرے ہیں بس اُنکا رم میرا نہیں

کون گزرا ہے یہاں سے بولے اے موجِ خیال
راہ میری ہے مگر نقشِ قدم میرا نہیں

دل کی سیپی دیر سے بیٹھی ہے منہ کو کھول کر
ایک قطرہ تجھ میں کیا ابرِ کرم میرا نہیں

کرمک شب تاب ہوں خود کو جلاؤں اب کہاں
تیرگی ہے دیر میں شمع حرم میرا نہیں



ہر حد سے پرے پیرہن تنگ سے باہر
خوشبو کی طرح ہوں ہوسِ رنگ سے باہر

میں ہوں کہ ابھی مجھ میں اک احساس ہے زندہ
ہے رقص شرر ورنہ رگِ سنگ سے باہر

ہمت مری کوتاہ ہے کیا پہنچوں میں تجھ تک
ہے اک یہ مسافت قدمِ لنگ سے باہر

ہر جادہ و منزل سے ہوں میں دور بہت دور
اب میری طلب ہے رہ و فرسنگ سے باہر



گزشتہ رات یہ اک کام دردناک کیا
کہ ہنستے بھولتے اس نے چراغ خاک کیا

مجھے ہلاک کیا اُس نے اس کا رنج نہیں
یہ رنج ہے کہ مری تیغ سے ہلاک کیا

میرا تمام ہنر گر گیا نظر انداز
نئے طریقے سے اب اس نے قصہ پاک کیا

چھپا دیا ہے ترا درد اہل دُنیا سے
یہ کام میں نے کیا اور بہ انہماک کیا

سبک خرام صبا سے نہ کر گلہ اب کے
گلوں نے اپنی رضا سے قبا کو چاک کیا

ستم کو دینے کو عنوان نیا فرید اس نے
پھر ایک بار حریفوں سے اشتراک کیا





بے برگ و بار سارے شجر دے گیا مجھے
اندیشہ نفع کا تھا ضرر دے گیا مجھے

دیکھے گئے ہیں شہر میں پھر سر بریدہ لوگ
کل رات وہ یہ تازہ خبر دے گیا مجھے

ہر صبح دیکھتا ہوں ستاروں کا ڈوبنا
میرا خدا یہ کیسا جگر دے گیا مجھے

بچوں کا شور غل نہ کھلونے جہاں پہ ہیں
رہنے کے واسطے وہی گھر دے گیا مجھے

میں خود ہی لگا کھینچنے اب اپنی ہوں تصویر
ہے اک یہ ہنر خامۂ ارژنگ سے باہر

اظہار کے سانچے میں نہ ڈھلتا ہے مرا درد
اتنا ہے زیادہ کہ ہے آہنگ سے باہر

صورت تری سیرت تری کس کس کا کروں ذکر
آنکھوں میں بسالوں ہیں دل تنگ سے باہر

ہر آن یہاں ٹوٹتے خوابوں کی ہے بہتات
نکلا نہ ابھی شہر مرا جنگ سے باہر





دُنیا کی طلب میں جسے پڑتے ہوئے دیکھا
اُس شخص کو حد سے کبھی بڑھتے ہوئے دیکھا

وہ دور ملا مجھ کو نصیبوں سے کہ جس میں
بچوں کو کبھی تتلی پکڑتے ہیں دیکھا

وہ میری طرح رہتا فقط ہے تیری دھن میں
کس وقت اُسے آپ اپنے سے لڑتے نہیں دیکھا

موسم کے بدلنے پہ تاسف یہ ہوا کیوں
جیسے کسی کو پہلے بچھڑتے نہیں دیکھا

کس وقت تلاش اپنوں کی اس کو نہیں رہتی
کس وقت اُسے خود سے جھگڑتے نہیں دیکھا

سایا ہو فریدؔ ان کا عطا جن کے کسی نے
سائے کو زمیں پر بھی پڑتے نہیں دیکھا



پھولوں کے ساتھ ہاتھ میں خنجر تھما دیا
شاید نشانِ فتح و ظفر دے گیا مجھے

شہکار جب بناؤں گا کاٹے کا میرے ہاتھ
وہ اس لئے متاعِ ہنر دے گیا مجھے

ہو جائے گی ہوا میں جو مٹھی کو کھول دوں
اک ایسی شئے وہ پچھلے پہر دے گیا مجھے

ہر شب ضرور شمعوں کی تلقین اس نے کی
ہر شب مگر بغیر سحر دے گیا مجھے

اپنی زبان منہ میں میرے ڈال کر فریدؔ
باتوں کا اپنی سارا اثر دے گیا مجھے



رُباعیاں



ستم گری کا نکالا ہے اس نے طور نیا
پرانے زخم پہ دیتا ہے زخم اور نیا
وہ میرے خواب بجھانے کی دُھن میں رہتا ہے
اسی لئے مرے اندر بپا ہے شور نیا
عجیب لطف دیا مجھ کو عشق تازہ نے
مرے وجود میں اب ناچتا ہے حور نیا
قدم قدم پہ بکھرتا ہوں ٹوٹ جاتا ہوں
نہ راس آتا ہے مجھ کو ذرا یہ دور نیا
پڑا اسی لئے اب تک ہوں سرد خانے میں
معاملہ ہے فقط ان کے زیرِ غور نیا
اذیتوں میں مجھے کیوں نہ لطف آئے فریدؔ
ستم کا ہاتھ پرانا ہے اور جور نیا





لمحوں کو جھمیلوں سے سجا کر خوش ہوں
اک ایک ہیولا میں بنا کر خوش ہوں
گہہ عیب چھپا کر ہوں بہت ہی آسودہ
آئینہ کبھی خود کو دکھا کر خوش ہوں



ناگفتہ بہ حالات کو کھولا نہ گیا
جذبوں کو کسی پلڑے میں تولا نہ گیا
حد درجہ بنا نقش تحیّر میں ہوں
یہ کس کا چھڑا ذکر کہ بھولا نہ گیا





ایسا نہیں میں قرضے چکا سکتا نہیں
میں خواب گھروندوں کو بنا سکتا نہیں
اتنا بھی ناتواں نہیں ہوں یارب
بارِ زن و فرزند اُٹھا سکتا نہیں



گل چیں سے نہ ہی تیز ہوا سے بچنا
نے تیغ جفا ، تیرِ قضا سے بچنا
حد درجہ ہے آلودہ یہاں پر ماحول
پھولوں سے کہو بادِ صبا سے بچنا





حد درجہ ہوں بے تاب مجھے مت چھیڑو
ہے مجھ میں سیلاب مجھے مت چھیڑو
میں جانتا ہوں صدق وصفا کا معنی
ہوں کشتۂ احباب مجھے مت چھیڑو



موجود ہو سب دل نہیں لگتا میرا
یا شامِ طرب دل نہیں لگتا میرا
جس سے نہ تری طلب کا ملتا ہو سرا
اس کام میں اب دل نہیں لگتا میرا





ہونے پہ مرے فتنہ جگایا میرا کیوں؟
اک طرفہ تماشا یہ دکھایا مرا کیوں ؟
جب شام ابد کرنا تھا مجھ کو رسوا!
پھر صبح ازل سجدہ کرایا مرا کیوں ؟



ہر وہم ویقیں پر ہوں قانع بھی میں
ہوں حکم گزیدہ بھی مانع بھی میں
حیراں نہ ہوں ایسے تضادات پہ دل
تخریب بھی ہوں میں ہی صانع بھی میں





اتنا بھی کر نہ پست ہمت مجھ کو
ہے جذبۂ دل تیری ضرورت مجھ کو
مانا کہ بہت دور ہے اب منزلِ دوست
طے کرنی ہے لیکن یہ مسافت مجھ کو



دُنیا کے ہر ایک کام میں تعجیل ہوئی
کب قربت دو روزہ سے تکمیل ہوئی
وہ ایک طلب بس تجھے پانے کی طلب
دل ہی میں نہیں روح میں تحلیل ہوئی





پھرتا ہے لئے خواب پریشاں کوئی
شل پاؤں کسی کے اور ہے عریاں کوئی
بکھراؤ نصیبوں میں مرے دور کے ہے
اس بات پہ لیکن نہیں حیران کوئی



جذبوں کو نئے سانچے میں ڈھالا میں نے
ہر بیم و رجا دل سے نکالا میں نے
کیا موت کرے گی زیست کو میری تلخ
اس کو تو ہے پہلے ہی جھٹالا میں نے





شاید کہ مجھے جان کے سادہ کوئی
اس فعل کا کرتا ہے اعادہ کوئی
دے کر مجھے فرقت کا وہی گہرا کرب
جینے کا کراتا ہے ارادہ مجھ کو



کس کس سے رہا تیرے لئے ربط مجھے
کرنا ہی پڑا کیا کیا یہاں ضبط مجھے
دنیا تو بہرحال ہے دنیا اے دوست
کس طور کا یہ بخشا گیا خبط مجھے





پانے میں تجھے رنج اُٹھایا کیا کیا
کچھ زیرِ نظر نہیں بہایا کیا کیا
دنیا کا ہو وہ نقد کہ عقبیٰ کا اُدھار
کیا تجھ کو خبر میں نے گنوایا کیا کیا



میں ہوں کہ نہیں اس کی بھی رد کرتا ہے
کم حد سے زیادہ مرا قد کرتا ہے
وہ بھاگنا دن بھر یہ سمٹنا شب بھر
خوابوں کو بھلانے میں مدد کرتا ہے





خواہاں ہوں ترے وصل کا میں ہر دم
وہ عیش کے ایام ہوں یا موسمِ غم
کل دیر تلک چلتی رہی تیز ہوا
لیکن نہ مٹا پائی تعلّق باہم



جو امر ہے آخر پہ نہی ہوتا ہے
چاہے سے نہ چاہے سے وہی ہوتا ہے
مرتا کبھی اخلاص ہے اخلاق کبھی
ہر ایک زمانے میں یہی ہوتا ہے





سامانِ طرب اے دلِ بے تاب بھی دیکھ
دروازہ کھلا رکھ کے نئے خواب بھی دیکھ
اپنوں سے ستم تیر و سناں غیر سے مانگ
جینے کے لئے جینے کے اسباب بھی دیکھ



اس طور سے وہ بچھڑا کبھی پھر نہ ملا
اک درد دیا ایسا کبھی پھر نہ ملا
جاتے ہوئے دیکھا تھا اُسی سمت اسے
اک نام ونشاں اس کا کبھی پھر نہ ملا





ہر اک کو بناتا ہے وہی اپنا ہدف
لمحاتِ گریزاں کو وہ رکھتا ہے بکف
تخریب سے روکے گا بھلا کون اُسے
وہ ایک طرف خلق خدا ایک طرف



معمول سے اپنے کبھی ہٹ کر دیکھے
خانوں میں یونہی خود کو نہ بٹ کر دیکھے
زندہ ہوں اس اُمیّد پہ اب تک میں فریدؔ
شاید وہ کبھی مجھ کو پلٹ کر دیکھے



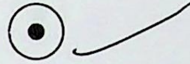


ہر شئے ہے مری اس پہ یقیں رہتا ہے
ہر لمحہ جواں اور حسیں رہتا ہے
جب پاس مرے ہوتے ہو تم تو واللہ
پھر وقت کا احساس نہیں رہتا ہے



دِل میں ابھی احساسِ ضرر باقی ہے
گر ہاتھ کٹا جذبہ مگر باقی ہے
بن سکتا ہے تیرے لئے یہ تازہ الاؤ
اس خس میں ابھی ایک شرر باقی ہے





اب کوئی بہانہ نہیں رونے کے لئے
آنکھوں میں رہا نہ اشک دھونے کے لئے
سب خواب تو آشوب زمانہ نے لئے
اب پاس مرے کچھ نہیں کھونے کے لئے



اک گھر نہ رہا تیرِ فضا سے محفوظ
اک سر نہ رہا تیغِ جفا سے محفوظ
اس رمز کی ہے پوری وضاحت درکار
کیسے میں رہا اَندھی ہَوا سے محفوظ





تجھ سے جو منسوب ہوئے جاتے ہیں
ناخوب ہو کے خوب ہوئے جاتے ہیں
ہوں زشت اگر افعال اُس پر بھی فریدؔ
مقبول اور محبوب ہو جاتے ہیں



ہر حرف کہن تازہ اثر سے گزرا
ایسی تھی خبر ہر اک خبر سے گزرا
لیکن ہے بتانے کی کہاں تاب مجھے
جو حادثہ رات نظر سے گزرا





بے صرفہ عمل سارے کے سارے نکلے
آہوں کے عوض منہ سے شرارے نکلے
ہمسائے کی چھپّر پہ رہی جس سے نہ پھوس
وہ تازہ گناہ سب ہمارے نکلے



پہلے کی طرح دل نہ دُکھانے آجا
آجا بس اک جھلک دکھانے آجا
کب میں نے کہا آ جا نہ جانے کے لئے
میرا ہے تو بس اتنا بتانے آجا







☆ فرید پربتی ہمارے ان شعراء کی صف میں آتے ہیں، جنہوں نے اپنی وہبی [illegible] کو مشق، مشاہدہ اور مطالعہ کے توسط سے نکھارا اور سنوارا ہے، وادیٔ کشمیر ہمیشہ سے فطر[illegible] کا مسکن رہی ہے۔ کالی داس جیسا عالمی فنکار اس وادیٔ گل پوش میں پیدا ہوا تھا۔ فر[illegible] نے سنسکرت، فارسی اور اردو کی شعری اور ادبی روایات کو بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے باطنی تحرک کا ☆ حصہ بنا کر اپنی تخلیقات پیش کی ہیں انہوں نے تقریباً سبھی شعری اصناف پر کامیاب طبع آزمائی کی ہے وہ سادہ بیانی (स्वभावोक्ति) اور پیچیدہ بیانی (वक्रोक्ति) دونوں کے رمز آشنا ہیں۔ ان کی شاعری میں خیر، حُسن اور صداقت کی دلآویز تصویریں دستیاب ہیں وہ لفظوں کے انتخاب میں ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار کثیر المعنویت سے آمیز ہیں۔ کشمیری ☆ آچاریہ آنند وردھن نے اس وصف کو بہت اہمیت دی تھی اسلوب، صنائع بدائع، موزونیت، پیچیدگی اور کیفیت آمیز انبساط کی مساوی موجودگی، دُھون (ध्वनि) کی نور پاشی کرتی ہے۔ یہ خصوصیت فرید پربتی کی تخلیقات میں نمایاں طور پر دستیاب ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ کسی خارجی نظریہ یا دبستان کی پیروی نہ کرتے ہوئے اپنی باطنی تحریک کے پاس دار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی تخلیقات کا ☆ محاکمہ شاعری کی آفاقی قدروں اور خصوصیات کی روشنی میں ہی کیا جاسکتا ہے۔

عنبر بہرائچی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-621-9

